خامی تھی ۔ یہ کہ کلاس میں سب لڑکوں کو ایک ہی طرح پڑھایا جاتا تھا ۔ اس پر قطعًا غور نہیں کیا جاتا تھا کہ ان طلبہ میں قوی کون ہے ۔ اور ضعیف کون، ذہین کون ہے اور غبی کون؟ لیکن عہدِ حاضر میں اس فرق کو بھی ملحوظ رکھا جاتا ہے اور مدرّس اپنے درس میں اس فرق کی پوری رعایت کرتا ہے ۔ اور اس طرح ہر طالب علم اپنی استعداد، صلاحیت، اہلیت اور ظرف کے مطابق درس سے فائدہ اُٹھاتا ہے ۔

درس کے ساتھ ہی ساتھ طریقِ درس بھی بدل جاتا ہے۔ ایک کامیاب اور ماہر مدرّس جس طرح انگریزی پڑھائے گا، جغرافیہ میں اس کا اسلوب بالکل بدلا ہوا ہوگا ۔ حساب میں کچھ اور ہوگا ۔ تاریخ میں کچھ اور ۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ ہر نصاب اور ہر درس کے ساتھ طریقِ تدریس حسب حال تبدیلی قبول کرتا جائے گا ۔ دُوسرے الفاظ میں یوں سمجھئے کہ ہر درس ایک خاص طریقِ تدریس کا طالب ہوتا ہے ۔

معلّم کو دو چیزیں خاص طور پر پیشِ نظر رکھنی چاہئیں:۔
(۱) تربیت کے اصول، نظریات اور قواعد پر اس کی اچھی نظر ہو۔
(۲) یہ کہ ہر نصاب اور درس کا طریقِ درس وہ پہلے سے سوچ بچار کے معیّن کرلے ۔

ماہر مدرّس وہی ہے، جو طفل کی حیثیت اور اہلیت سے قرار واقعی واقف ہو اور صحیح راستہ کی طرف لے جا سکے ۔ مدرّس کو چاہیئے کہ وہ خود اپنے تئیں بچہ سمجھ لے۔ اور اس کے ساتھ قدم بہ قدم پاؤں پاؤں چلے ۔ یہاں تک کہ اسے مردِ کامل بنا دے اور اس مقصد تک پہنچ جائے ۔ جو منتہائے نظر ہے ۔

تربیتِ جدید کے بنیادی مسائل

جدید فنِ تربیت کے اہم مبادیات

اب ہم جدید فنِ تربیت کے اہم اور بنیادی مسائل کا نمبروار تذکرہ کرنا چاہتے ہیں :-

۱- تلامیذ کے میلان کی رعایت، تاکہ وہ درس سے پُورا پُورا فائدہ اُٹھا سکیں!

۲- تلامیذ کے نشاطِ ذاتی میں اشتراک، تاکہ وہ اُستاد کے ساتھ گھُل مِل سکیں، اور اپنے اعمال و افکار میں اس کی مدد، بطورِ خود حاصل کر سکیں ؛

۳- کھیل کو وسیلۂ تربیت بنانا، کہ کھیل کھیل میں بھی طلبہ کو بہت کچھ سکھایا اور سمجھایا جا سکتا ہے۔ خاص طور پر مرحلۂ طفولیت میں تو یہ طریقہ بہت کارگر ثابت ہوتا ہے ؛

۴- تہدید، مار پیٹ، ڈانٹ ڈپٹ کے بجائے، تلامذہ کو سمجھا بُجھا کر راہ راست پر لانے کی کوشش کرنا ؛

۵- طلبہ میں درس اور عمل کی رغبت پیدا کرنے کی سعی کرنا۔ تاکہ وہ جو کچھ کریں، اور جو کچھ پڑھیں اس میں جبر کو دخل نہ ہو۔ بلکہ شوق اور رغبت کی کارفرمائی ہو ؛

۶۔ بچّہ کے بچپن کی پُوری پُوری رعایت ملحوظِ خاطر رکھنا اور اسے تمام باتوں اور کاموں پر مقدم رکھنا، اور اس طرح اسے آنے والی زندگی کے لئے تیار کرنا، تاکہ تعلیم نظری اور عملی میں تطابق اور ہم آہنگی پیدا ہو اور بچّہ بھاگے نہیں، بلکہ از خود آئے ٭

۷۔ تعاون اور اشتراک کی اسپرٹ پیدا کرنا، ایسی رُوح کہ تلمیذ مدرّس سے، معلّم تلمیذ سے، باپ اُستاد سے، گھر مدرسہ سے، متعلّم کے نہوض اور ارتقا کے لئے، سچّائی کے ساتھ، ایک دُوسرے کی مدد کریں۔ ایک دُوسرے سے اشتراکِ عمل اور تعاون کریں ٭

۸۔ تلامیذ میں اعتمادِ نفس کی رُوح پیدا کرنا تاکہ وہ دُوسرے کے بجائے خود اپنے اوپر، اپنی ذہانت اور عقل پر بھروسہ کرنے کے عادی بنیں۔ اپنے اعمال اور بحث میں ان کی نظر کسی دُوسرے پر نہ پڑے بلکہ وہ خود ہی اپنی ذات کا سہارا لیں۔ مدرّس سے صرف اس وقت مدد لیں، جب بےبس ہوجائیں ورنہ اپنے شعور سے کام لیں ٭

۹۔ حواس سے پُورا پُورا فائدہ اُٹھانا، اور حواس کی پُوری پُوری تربیت کرنا کہ حواس کی تربیت درحقیقت عقل کی تربیت ہے!

نئے تدریسی تجربے

قدیم اندازِ تدریس سے فائدہ اُٹھانے
کے ساتھ ساتھ، عصرِ حاضر نے کچھ نئے تدریسی
تجربے بھی کئے ہیں جو برسرِ کار ہیں۔ آنے
والے صفحات میں ان تجربوں کو ہم نام بہ نام
ذرا بسط و تفصیل کے ساتھ درج
کرتے ہیں ٭

296 page is Empty

طریقہ استنباطیہ

یا

طریقۂ استقرائیہ [1]

طریقۂ استقرائیہ یا استنباطیہ کا مقصود یہ ہے کہ معلم حقائق تک پہنچے۔ احکامِ عامہ کو سمجھے اور اس کام میں طرقِ بحث و استقرا و استنباط نظرانداز نہ ہونے پائے اس طریقہ کا بنیادی اصول یہ ہے کہ پہلے جزئیات کو لیتے ہیں۔ اور جزئیات سے کلیات اور قاعدۂ عامہ تک پہنچتے ہیں۔ مثلاً ایک مسئلہ ہے، معلم تختۂ سیاہ پر اس کی متعدد مثالیں لکھتا ہے، یہاں تک کہ ایک قاعدہ مرتب ہو جاتا ہے۔ اور بہت سی مثالیں دیکھ کر خود تلمیذ قاعدہ بھی مرتب کر لے سکتا ہے۔ اور مثالیں بھی پیش کر سکتا ہے۔ اس طرح تلامیذ کی قوتِ فکر ترقی کرتی ہے۔ اور غبی و بطی طالب علم کی فکر بھی روشن ہو جاتی ہے۔

یوحنا فریڈرک ہربرٹ[2] کے بنائے ہوئے اصولوں پر

---

[1] The Inductive method.

[2] یوحنا فریڈرک ہربرٹ ——— جرمنی کا یگانۂ روزگار ماہر تعلیم

(باقی نوٹ اگلے صفحے پر)

یہ طریقہ وضع کیا گیا ہے۔ اس کے بتلائے ہوئے طریقہ کا ایک پورا سلسلہ ہے، جو "سلسلۂ ہربرٹ" کے نام سے موسوم ہے۔ اس سلسلہ کی ہر کڑی عمل اور تحقیق پر مبنی ہے۔ تاکہ درس کا صحیح مقصود حاصل ہو سکے۔ اور یہ مقصود، ایک مرتب اور منظم اصول کو سامنے رکھ کر حاصل ہو

ہربرٹ نے جو اصول وضع کئے ہیں۔ ان میں چار اصول خاص طور پر بڑی اہمیت رکھتے ہیں:-

۱۔ وضاحت
۲۔ لفظ و معنی کے درمیان ربط
۳۔ نظام
۴۔ طریق و اسلوب

وضاحت اس کا مقصد ہوتا ہے، متعلمین کو نئے سبق کے لئے تیار کرنا اور ان میں تشویق پیدا کرنا۔ طلبہ کے قدیم اور جدید معلومات میں ربط پیدا کرنا اور انہیں تطبیق دینا۔ طلبہ کے اذہان کو نئے سبق کے لئے آمادہ کرنا۔

معنی اور ربط یعنی درس میں مرتب طور پر حقائق پیش

(بقیہ نوٹ صفحۂ گزشتہ) علم النفس، ۱۷۷۶ء میں پیدا ہوا۔ ۱۸۴۱ء میں وفات پائی۔ اس کی ماں نے اس کی تربیت پر بڑی توجہ کی تھی۔ سوئٹزرلینڈ کے ماہر تعلیم و علم النفس پستالوزی کا یہ رشتہ دار تھا۔ اس کا نظریہ یہ تھا کہ بچہ جب پیدا ہوتا ہے تو بے عقل ہوتا ہے۔ پھر بعد میں جو عقل آتی ہے وہ نتیجہ ہوتی ہے تربیت کا!

کرنا، پھر طلبہ کو باہمی جدل و بحث کا موقع دینا کہ وہ کنہ تک پہنچیں اور صحیح نتیجہ اخذ کرلیں - جدید و قدیم معلومات میں ربط پیدا کریں - متشابہ اور متضاد اشیا میں موازنہ کر کے صحیح رائے قائم کرسکیں ٭

نظام | عناصر کی ایسی منظم ترتیب کہ صحیح حکم لگانے میں کوئی دشواری نہ ہو - بلکہ آسانی کے ساتھ صحیح حکم لگایا جاسکے - یا بغیر کسی زحمت کے قاعدہ مستنبط کیا کیا جاسکے - یعنی عقل محسوس سے معنی کی طرف منتقل ہوسکے ٭

طریق و اسلوب | یہ مرحلہ ہے تطبیق اور مراجعت کا قاعدہ کی معرفت کے بعد اس کی تثبیت مشقوں اور سوالوں کے ذریعے بہت آسان ہو جاتی ہے اس طریقہ پر عمل کرنا ٭

ہربرٹ کے بعض متبعین مثلاً زیلر (۱۸۱۷ء-۱۸۷۲ء) اور رین (ولادت ۱۸۴۷ء) وغیرہ نے کچھ اور تنقیحات وضع کی ہیں، جو پانچ ہیں :-

(۱) مقدمہ
(۲) عرض
(۳) ربط
(۴) استنباط
(۵) تطبیق و مراجعت

ہربرٹ کے طریقے پر عمل کرنے کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ عقل کے لئے تکوینِ حکم آسان ہوجاتی ہے - یہ طریقۂ عقلی اصول تحلیل شئے پر مبنی ہوتا ہے - پھر اس چیز اور دُوسری چیز کے مابین موازنہ میں کوئی دُشواری نہیں رہتی - متشابہ اور متضاد اشیا میں تمیز کرنا بھی آسان ہو جاتا ہے - اور اس بحث کے بعد حکم لگانے میں بھی کوئی پریشانی نہیں ہوتی - اور پھر عام حکم ذہن و دماغ پر اچھی طرح نقش ہو جاتا ہے - اگر تمرنیات (مشق) تطبیقات، اعادہ اور مراجعت سے صحیح کام بن جائے تو زیرِ بحث قاعدہ تلمیذ کے دل میں گھر کرلیتا ہے ؛

ہربرٹ کے اس اصول نے ۱۹ویں صدی کے نِصف آخر میں فنِ تدریس و تعلیم پر بہت اثر کیا - ۱۸۹۰ء میں اپنی مقبولیت کے باعث یہ طریقہ جرمنی سے چل کر انگلستان میں بھی رائج ہو گیا - اور ہربرٹ اور اس کے جانشینوں کے بنائے ہوئے اصول اربعہ یا خمسہ، بہت سے اسکولوں اور کالجوں میں داخل ہوگئے ؛

نقد و تبصرہ موجودہ وقت میں اصولِ استقرائی، تقریباً غیر طبعی سا ہوگیا ہے - اور اس کی افادیت پہلے سے کم ہوگئی ہے - اس کا یہ مطلب نہیں ہے - کہ ہم ہربرٹ کی اس عظیم و جلیل خدمت سے انکار کر رہے ہیں جو اس نے تعلیم و تدریس کی انجام دی - وہ پہلا شخص ہے جس نے حجرۂ درس میں عملی طریقہ کو رواج دیا - لیکن ہمیں یہ نہ بھولنا چاہئے - کہ ایک

چیز ہر زمانہ میں یکساں مفید نہیں رہتی۔

اس طریقہ میں ایک اور نقص بھی ہے۔ یہ مدرّس کے لئے بہت زیادہ تکلیف دہ ہوتا ہے۔ اس میں تلمیذ کو فکر و غور کی زیادہ فرصت بھی نہیں ملتی۔ وہ اپنے اوپر پُورے طور پر اعتماد بھی نہیں کر پاتا۔ محتاجِ امداد رہتا ہے۔ اس طریقہ سے جو فائدہ ہے وہ یہ ہے کہ افکار مرتب ہو جاتے ہیں۔ درس قدیم و جدید میں ربط پیدا ہو جاتا ہے۔ مدرّس طلبہ کے قویٰ کے مطابق ان کے ساتھ قدم بہ قدم چل سکتا ہے۔ طلبہ میں موازنہ، ملاحظہ اور حکم لگانے کا مادّہ پیدا ہو جاتا ہے۔ مدرّس طلبہ کو علم کا شائق بنا دیتا ہے۔ اور آسانی کے ساتھ تعبیرِ افکار کی صلاحیت پیدا کر دیتا ہے۔ طلبہ کے ذہن میں موادِ تعلیم کو راسخ کر دیتا ہے۔ ساتھ ہی ساتھ یہ بات بھی ہے کہ اس طریقے کو برتنے میں مدرّس کو کافی زحمت اُٹھانی پڑتی ہے ؛

طریقۂ قیاسیہ[1]

طریقۂ قیاسیہ، طریقۂ استقرائیہ کے بالکل برعکس ہے۔ اس میں سب سے پہلے قواعد اور تعریف کو یاد کرنا پڑتا ہے۔ پھر مثالوں سے اس کی تشریح کی جاتی ہے۔ یہ طریقہ چھوٹے بچوں کے لئے بالکل موزوں نہیں ہے۔ لیکن بڑے طلبہ کے لئے بہت موزوں ہے۔ یہ طریقہ طالب علم کے لئے راحت ہے اور مدرس کے لئے مصیبت۔ طالب علم کو کام کم کرنا پڑتا ہے۔ مدرس کو زیادہ۔ یہ فن تاریخ، لغت اور علوم ریاضیہ میں بہت بکار آمد ہے۔

معلم کے لئے بہتر اور مناسب طریقہ یہ ہے کہ وہ طریقۂ استقرائیہ اور طریقۂ قیاسیہ کو مجتمع کر کے کام چلائے ان دونوں طریقوں کو ساتھ ساتھ اگر برتا جائے تو بہت اچھا ہے۔ یہ دونوں طریقے ایک ہی درس میں بروئے کار لائے جا سکتے ہیں۔ مثلاً اس طرح کہ مدرس پہلے مثالیں پیش کرے۔ پھر طلبہ کو بحث وجدل کا موقع دے۔ یہاں تک کہ وہ اصول اور قاعدہ مستنبط کرسکیں۔ پھر اس کا اعادہ کرائے۔ اور اس قیاس کو بنیاد قرار دے کر تطبیق دے جو قاعدہ حاصل ہوا ہے یہاں تک کہ بات ذہن میں راسخ ہو جائے۔

[1] The Deducteve method

دونوں اصولوں میں موازنہ

جیسا کہ ہم بتا چکے ہیں طریقۂ استقرائیہ میں مدرّس تلامیذ کے ذہن کو خاص سے عام کی طرف منتقل کرتا ہے مثالیں پیش کر کے قواعد کی تشکیل کرتا ہے۔ جزئیات سے کلیات تک پہنچتا ہے طریقۂ قیاسیہ اس کے بالکل برعکس ہے۔ اس میں یہ ہوتا ہے کہ مدرّس طلبہ کے ذہن کو عام سے خاص کی طرف منتقل کرتا ہے۔ اس میں قاعدہ سے مثالیں بنائی جاتی ہیں۔ اور کلیات سے جزئیات تک پہنچا جاتا ہے۔ اس اصول میں مدرّس طلبہ پر اعتماد نہیں کرتا۔ بلکہ وہ قاعدہ اور اصول پیش کرتا ہے۔ اور طلبہ اسے سُنتے اور یاد کرتے ہیں۔ اس میں طلبہ اپنے بجائے مدرّس پر تکیہ کرتے ہیں۔ یوں سمجھنا چاہئے، طریقۂ استقرائی طریقۂ ایجابی ہے۔ اور طریقۂ قیاسی، طریقۂ سلبی۔ یہ غلطی ہے کہ ان دونوں میں سے کسی ایک پر اکتفا کر لیا جائے مناسب اور بہتر یہ ہے کہ دونوں سے فائدہ اُٹھایا جائے۔ اور دونوں کو برتا جائے۔ کیونکہ طلبہ بحث و درس میں طریقِ استقرائی کے محتاج ہوتے ہیں اور مرحلۂ تطبیق میں انہیں طریقۂ قیاسیہ سے فائدہ پہنچتا ہے۔ یہاں تک کہ قاعدہ ذہن میں پُورے طور سے راسخ ہو جاتا ہے۔ استقرا سے ہم قاعدہ تک پہنچتے ہیں قیاس سے مشق تک ؛

طریقۂ اخباریہ

یا

(۲) طریقۂ محاضرات

اقتصادی نقطۂ نظر سے یہ طریقہ بہت مفید و مستحسن ہے۔ اس طریقہ کی رُو سے لیکچروں یا کتابوں کے ذریعہ تعلیم دی جاتی ہے۔ اور انسان ایک ہی حالت میں ہزاروں لاکھوں آدمیوں کو زیورِ تعلیم سے بہرہ ور کرسکتا ہے۔

یہ طریقہ نیا نہیں ہے۔ عہدِ قدیم سے رائج ہے۔ پہلے زمانہ کے کالجوں اور جامعات میں عرصۂ دراز سے یہ طریقہ چلا آ رہا ہے۔ جس زمانہ میں کتابوں کی طبع و اشاعت کا انتظام نہیں تھا تو قرونِ وسطیٰ میں جامعات نے، لیکچروں کا اچھا سلسلہ شروع کر رکھا تھا۔ ان لیکچروں میں ہزارہا طلبہ شرکت کیا کرتے تھے۔ اُستاد لیکچر دیتا تھا اور طلبہ گوشِ ہوش سے سُنتے تھے۔ یہ طریقہ عہد جدید میں بھی یورپ، امریکہ، مصر اور دُوسرے ممالک میں رائج ہے۔

یاد رکھنا چاہیئے کہ طریقِ محاضرات (لیکچرز) سے صرف بڑی عمر اور بڑے درجوں کے طلبہ پُورے طور پر مستفید ہوسکتے ہیں۔ ابتدائی اور ثانوی مدارس کے طلبہ کے لئے

یہ طریقہ کچھ زیادہ سودمند نہیں ہے۔ روسو کا خیال ہے کہ چھوٹے لڑکوں کے سامنے تقریروں اور لیکچروں کا سلسلہ زیادہ طویل نہ ہونا چاہیئے۔ اس لئے کہ وہ ان چیزوں کی طرف زیادہ متوجہ نہیں ہوتے۔ اور بہت کم سمجھتے ہیں۔ نہ سمجھنے کے برابر ؛

طریقِ محاضرات کے عیوب

طریقِ محاضرات میں کچھ عیوب بھی ہیں۔ اور اس قابل ہیں کہ ان کا ذکر کیا جائے :۔

۱۔ اس سے طالب علم کا اعتمادِ نفس کم ہو جاتا ہے۔ قوتِ عمل کمزور پڑ جاتی ہے۔ وہ بحث و استقصا سے کترانے لگتا ہے ؛

۲۔ لیکچر دینے والا اپنے لکھے ہوئے لیکچر کو جلدی جلدی پڑھتا ہے۔ اور سُننے والے طلبہ جلدی جلدی اس لیکچر سے اپنے نوٹ لیتے ہیں۔ نوٹ لیتے وقت بہت سی چیزیں چھُوٹ بھی جاتی ہیں اور بہت سی باتیں ذہن و دماغ پر مرتسم بھی نہیں ہوتیں ؛

خلاصۂ کلام یہ کہ طریقِ محاضرات بہت زیادہ سُودمند نہیں ہے۔ اور اگر کسی درجہ میں ہے تو صرف کالجوں اور یونیورسٹیوں کے طلبہ کے لئے۔ اور ایسے طلبہ کے لئے وقت بچانے کا بہترین ذریعہ ہے۔ انہیں ایک مرتب اور منظم درس مِل جاتا ہے۔ اور وہ اس سے پُورا پُورا فائدہ اُٹھا لیتے ہیں ؛

طریقۂ سقراطیہ
یا
طریقۂ حواریہ

یہ طریقہ سقراط[1] کی طرف منسوب ہے۔ سقراط یونان کا باشندہ تھا۔ اس طریقہ میں سوال و جواب پر تعلیم کا انحصار ہوتا ہے، یا نقش و رسم سے کام لیا جاتا ہے۔ اس کا مقصد یہ ہے کہ طلبہ کو معلومات کا خزینہ بنا دیا جائے۔ ان میں حقیقت کی تلاش کا جذبہ پیدا کر دیا جائے۔

اس طریقہ کو جاری کرنے سے سقراط کا اہم ترین مقصد یہ تھا کہ عقلِ انسانی سے اوہام کا ازالہ ہو جائے اور ان مصیبتوں سے نجات مل جائے۔ جو علم اور تعلیم کے راستہ میں حائل تھیں۔ اس طریقہ میں سوالات کے ذریعہ طالب علم کی حس کو اُبھارا جاتا ہے تاکہ وہ بحث و تنقیب اور تفکیر و تہذیب کا خوگر بن سکے ۔

نقد و تبصرہ | یہ طریقہ اگرچہ فکرِ عمیق کا موجب ہے اور یہ بہت

---

[1] "Socrates" ۴۶۹ قبل مسیح میں پیدا ہوا اور ۳۹۹ ق۔م وفات پائی۔ یونان کے فلاسفہ کا امام تھا۔ اس کے فخر کے لئے یہ کافی ہے کہ یہ افلاطون کا اُستاد تھا۔ علمائے فلسفہ کا یہ قول بالکل حق بجانب ہے کہ "سقراط پر آسمان سے فلسفہ نازل ہوا بڑے ظلم اور فسادت کے ساتھ جاہلوں کے ہاتھوں یہ اس دُنیا سے رُخصت ہوا ۔

بڑا فائدہ ہے - لیکن اس میں ایک نقص بھی ہے وہ یہ کہ اس میں بہت بڑی مدت حقیقت کی تلاش و جستجو اور اس تک پہنچنے میں صرف ہوتی ہے - کمزور قسم کے مدرسین تو اس سے بالکل فائدہ نہیں پہنچا سکتے - نہ خود مستفید ہو سکتے ہیں - اس طریقہ کو بروئے کار لانے کے لئے بہت زیادہ قابلیت اور مہارت کی ضرورت ہے - اس میں تلمیذ اور مدرس دونوں کو بہت زیادہ چوکس رہنا چاہیئے - یہ طریقہ طریقۂ ارشادیہ اور طریقۂ تنقیبیہ کا جامع ہے - اس لئے کہ یہ بحث، ارشاد اور فکر کا ہمیشہ جویا رہتا ہے ؛

بعض لوگ اسے سب سے بہتر طریقۂ تعلیم سمجھتے ہیں۔ لیکن وہ اسے فراموش کر دیتے ہیں کہ یہ کثیر وقت میں بہت قلیل فائدہ پہنچاتا ہے - معلّم اگر اس طریقہ میں کامیاب ہونا چاہتا ہے تو اسے چاہیئے کہ وہ درس کی پوری تیاری کرے سوالات پوری دقّتِ نظر سے مرتّب کرے - تاکہ آسانی کے ساتھ وہ طلبہ کے اذہان تک رسائی حاصل کر سکے - سقراط صرف سوالات کے ذریعے اپنا مفہوم واضح کرتا تھا - اور دوسرے کا مفہوم اگلواتا تھا - اسی طرح وہ تلمیذ میں بحث و استقصا کا مادّہ پیدا کرتا تھا - تاکہ وہ حقیقت تک پہنچ سکے ؛

---

(۵) طریقۂ تنقیبیہ

یہ طریقہ بحث و تنقیب پر مشتمل ہے۔ جس میں کتبِ معینہ سے خاص موضوعات تک رسائی ہوتی ہے اور مدرّس تلامیذ کے سامنے درسِ کتابی دیتا ہے۔ تاکہ طلبہ ان کتابوں سے فائدہ اُٹھائیں۔ اور ایک محدود مدّت میں نفع اندوز ہو لیں

عہدِ حاضر میں، یہ طریقہ سب سے زیادہ مفید اور کارگر ہے۔ اس سے تلمیذ کے اندر اعتمادِ نفس کا مادّہ پیدا ہوتا ہے۔ اور بچپن ہی سے وہ کثرتِ اطلاع اور کثرتِ مطالعہ کا عادی ہو جاتا ہے۔ مدارسِ ابتدائیہ میں اسے تیسرے یا چوتھے سال سے بآسانی شروع کیا جاسکتا ہے۔ مدارسِ ثانویہ اور متوسطہ میں تو اس سے بہت زیادہ فائدہ اُٹھایا جاسکتا ہے ؛

اب ہم اس طریقہ کے چند خاص اور متداول طریقوں کا ذِکر ذرا تفصیل و وضاحت سے کرتے ہیں۔ تاکہ جدید زمانہ کا یہ اسلوب بھی متعلّم اور معلّم کے پیش نظر رہے۔ اور اس سے وقت اور موقع کی مناسبت سے خاطر خواہ فائدہ اُٹھایا جاسکے ؛

ان طریقوں کو ہم الگ الگ اور نام بہ نام ذِکر کریں گے۔

(۱) طریقۂ ڈلٹن[۱]

یہ طریقہ امریکہ کی مشہور ماہر تعلیم خاتون، ہیلن پارکھرسٹ[۲] کی طرف منسوب ہے۔ ۱۹۱۹ء میں، یہ طریقہ رائج ہوا۔ بعض لوگ قلتِ معلومات کے سبب اس غلط فہمی میں مبتلا ہیں کہ یہ طریقہ مسٹر ڈلٹن کی ایجاد ہے۔ حالانکہ یہ غلط ہے۔ واقعہ صرف اتنا ہے کہ ڈلٹن امریکہ کا ایک شہر ہے۔ جو صوبۂ مساشٹ[۳] میں واقع ہے۔ اس طریقہ کو یہیں آزمایا گیا، اور برسرِکار لایا گیا۔ شاید اسی لئے اس شہر سے یہ منسوب ہوگیا۔

طریقۂ ڈلٹن کا مقصد

اس طریقہ کا مقصد یہ ہے کہ طلبہ کے مابین کوئی امتیاز نہیں روا رکھا جاتا۔ نہ درجہ بندی کو کوئی خاص اہمیت دی جاتی ہے۔ اس میں ذہین و غبی، تیز اور سست، قوی اور ضعیف طالب علم کے درمیان بھی کوئی فرق ملحوظ نہیں رکھا جاتا۔ اس میں طلبہ کو پوری آزادی دی جاتی ہے کہ وہ خوب جی کھول کر

---

۱ Dalton plan

۲ Miss Helen Parkhurst

۳ Massach Husetts.

بحث کریں ، مطالعہ کریں ، ضرورت محسوس کریں تو اُستاد کی مدد حاصل کرلیں ۔ اس میں بہت زیادہ زور خبس چیز پر دیا جاتا ہے ۔ وہ یہ ہے کہ طلبہ اپنے اوپر اعتماد کرنے کے عادی بنیں ۔ یہاں تک کہ بڑے ہوکر عملی آدمی بن سکیں ان میں تعاون اور امدادِ باہمی کی رُوح پیدا ہو جائے ۔ اس میں ضعیف پیچھے نہیں رہنے پاتا ، اور ذکی کا ، غبی کے انتظار میں وقت نہیں ضائع ہوتا ۔

مبادیات اس سسٹم کے مبادی حسب ذیل ہیں:-

(۱) تلامیذ اُستاذ کے ساتھ شریکِ عمل ہوں گے

۲ - اِس سسٹم میں طریقۂ تلقینیہ یا اخباریہ (لیکچرز) جو قرونِ وسطیٰ میں رائج تھا کم برتا جاتا ہے ۔

۳ - حجرۂ درس ، لیبوریٹری اور تجربہ گاہ میں تبدیل ہوتا جاتا ہے تاکہ طلبہ بطورِ خود تجارب حاصل کریں اور مشق کریں ۔

۴ - اس سسٹم میں مظاہر سے زیادہ حقائق پر غورِ کیا جاتا ہے ۔

۵ - افکار اور تجارب میں ربط پیدا کیا جاتا ہے ۔ تاکہ مسئلہ بالکل واضح اور ازبر ہو جائے ۔

۶ - طلبہ کو اس سسٹم میں پُوری آزادی دی جاتی ہے ۔ کہ وہ نتیجہ تک پہنچنے کے لئے جو وسیلہ اور ذریعہ اختیار کریں ۔ اُستاد صرف حسب ضرورت ، امداد و اعانت یا مداخلت کرتا ہے ۔

۷ - سبق بار بار دہرایا جاتا ہے اور کافی وقت حصولِ

نتائج کے لئے دیا جاتا ہے۔ تاکہ طلبہ خود اپنے اعمال و افکار مرتّب کر سکیں ٭

۸۔ ہر مدرّس ایک مخصوص نصاب کا ذمّہ دار ہوتا ہے اور ایک ہی کلاس لیتا ہے ٭

۹۔ طلبہ میں سے ہر ایک کی استعداد پیشِ نظر رکھی جاتی ہے تاکہ ہر فرد اپنے عقلی اور علمی درک کا صحیح استعمال کر سکے۔ اور اپنی مناسبت کے لحاظ سے جماعت سے اشتراک کر سکے ٭

تعیینات کی مثالیں

اب ہم اس سلسلہ میں چند خاص تعیینات کا ذِکر کرتے ہیں جو ڈلٹن سسٹم میں بھی برتے جاتے ہیں ٭

۱۔ کتاب کی طرف مراجعت

۲۔ جواب دینے سے پہلے کتاب سے امداد،

۳۔ اگر بعض مسائل میں دُشواری پیش آئے۔ تو پہلے اپنے سے بڑے طلبہ سے دریافت کیا جائے۔ پھر بھی مشکل حل نہ ہو تو لغت سے رجوع کیا جائے پھر بھی کام نہ چلے تو اُستاد کو تکلیف دی جائے

۴۔ کتاب کی قرأت سے فراغت کے بعد، اور اس کے مطالب سمجھنے کے بعد حسب ذیل سوالات کا جواب دو :۔

(ا) اس کتاب کی کون سی حکایت پسند آئی ؟ وہ حکایت بیان کرو ٭

(ب) کتاب کے کیرکٹروں میں سے کونسا آدمی پسند

آیا ؟ اور کیوں پسند آیا ؟ اس کے بعض کارناموں کا ذکر کرو ۔

(د) دو فصلوں والی کوئی حکایت مختصر طور پر تحریر کرو ۔ ہر فصل، کتاب ہی سے ماخوذ ہو ۔ یا کسی ایسے موضوع پر لکھو، جو تمہیں پسند ہو ۔ یا کسی ایسے آدمی پر جس کی جانب تم مائل ہو ۔ لیکن میں سطروں سے زیادہ نہیں ۔

اس سسٹم کے فائدے

اس سسٹم کا سب سے بڑا فائدہ یہ ہے ۔ کہ طالب علم کے اندر اعتماد علی النفس پیدا ہو جاتا ہے ۔ وہ اپنے قوائے عقلی کا استعمال کرنے لگتا ہے ۔ حکم لگانے کی اس میں استعداد پیدا ہو جاتی ہے ۔ اپنی بات اور اپنے کام پر بھروسہ کرنے لگتا ہے ۔ اثنائے عمل میں جو مشکلات پیش آتی ہیں ان پر غالب آنے کی صلاحیت پیدا کر لیتا ہے ۔ درس کے سلسلے میں ایک خاص نظام اور ایک خاص ترتیب کا خوگر ہو جاتا ہے ۔ اسے اچھی طرح سمجھنے لگتا ہے ۔ اور ٹھیک سے جواب دینے لگتا ہے اطلاع دہی اور قرآۃ (مطالعہ) سے اسے دلچسپی پیدا ہو جاتی ہے ۔

جب ہم تلمیذ میں علم کا شوق پیدا کرلیں تو اسے کامیاب بنانے میں کوئی دشواری پیش نہیں آتی ۔ وہ نہ صرف امتحان میں کامیاب ہو جاتا ہے ۔ بلکہ اپنی عملی زندگی میں بھی کامیاب رہتا ہے ۔ اس طرح اس کے سامنے

نئی نئی راہیں کھُل جاتی ہیں - اور وہ ان سے پُورا پُورا فائدہ اُٹھاتا ہے - اسے اتنی فرصت ملتی ہے کہ وہ اپنی عقل، فکر اور ذکا سے، پُورا پُورا فائدہ اُٹھا سکے - اور اپنے امیال و عواطب، اور اپنی صلاحیتوں کو نمو بخش سکے یہاں تک کہ وہ اس قابل ہو جائے کہ مستقبل میں عملِ جلیل کا ہیرو بن سکے - یا کوئی بہترین ایجاد کر کے نام پیدا کر سکے - یا کوئی ایسی کتاب لکھ کر شہرت حاصل کر لے - جو سب کے لئے نافع اور مفید ہو ٭

(۲) مانٹسوری سسٹم

ماریا مانٹسوری[1]، اٹلی کی مشہور اور یکتا طبیبہ تھی، اس کی طرف یہ سسٹم منسوب ہے۔ اس کے اس سسٹم نے اتنا قبولِ عام حاصل کیا کہ نہ صرف اٹلی میں، بلکہ انگلستان اور امریکہ کے بھی بہت سے مدارس میں مقبول اور رائج ہوا۔

اس سسٹم کا مقصد

مانٹسوری نے یہ محسوس کیا کہ تربیت کا مقصد، تربیتِ شخصی ہے۔ لہٰذا اس نے اپنے تعلیمی سسٹم میں سب سے زیادہ زور اسی پر دیا کہ بچہ خود کفیل ہو، خود سمجھے، خود کرے۔ دوسرے کے بجائے خود اپنے اوپر بھروسہ کرے۔ اس سسٹم کے ماتحت طلبہ کو بتایا جاتا ہے کہ انہیں دوسروں کے ساتھ کس طرح زندگی بسر کرنی چاہیئے۔ کھیل اور کام میں کس طرح تعاون اور اشتراک کرنا چاہیئے۔ اپنے کاموں میں کس طرح خود اپنے اوپر بھروسہ کرنا چاہیئے؟ نیز یہ کہ تعلیمی کھیلوں سے کس طرح کسبِ علم و معلومات کرنا چاہیئے؟

---

[1] Dr. Maria Montessori

اس سسٹم کے ماتحت بچے، اُستاد کی نگرانی میں چھوڑ دیئے جاتے ہیں۔ تاکہ اپنی رغبت اور پسند کے مطابق وہ کام کریں۔ اور چلیں پھریں۔ انہیں اپنے کام کے سلسلہ میں پُوری آزادی دے دی جاتی ہے۔ وہ خود اپنے نکتہ چیں اور نگراں بنادیئے جاتے ہیں۔

مبادیات مانٹسوری سسٹم میں، تعلیم کے اندر فرد کو ایک وحدت تسلیم کیا جاتا ہے۔ حالانکہ قدیم طریقۂ تعلیم میں نظامِ تعلیم اجتماعی بنیادوں پر قائم تھا۔ اس سسٹم کے مبادیات حسب ذیل ہیں :-

۱- عمل میں طلبہ کو پُوری پُوری آزادی اعتمادِ نفس کی تشکیل صرف بوقتِ ضرورت معلّم کی مداخلت، ورنہ کامل عدمِ مداخلت، مطالعہ کے لئے کافی وقت اور فرصت کی بہمرسانی۔

۲- اس سسٹم میں اسباق کا باقاعدہ سلسلہ نہیں ہوتا اور نہ درس کے اوقات معیّن ہوتے ہیں۔ ہر بچّہ اپنی نوعیّت کے مطابق پڑھتا ہے۔ جب کھیلنے پر مائل ہوتا ہے کھیلنے لگتا ہے۔ تربیتِ علمی و عملی کے سلسلہ میں اسے ہر قسم کے بہتر سے بہتر وسائل ہوتے ہیں۔

۳- اس سسٹم میں باقاعدہ کلاس سسٹم (درجہ بندی) نہیں ہوتا۔ جیسا عام طور پر مدارس میں ہوتا ہے۔

۴- اس سسٹم کے ماتحت مدرسوں میں ثواب و عقاب کا اصول جاری نہیں ہوتا۔ بچّہ کو یہ محسوس نہیں ہونے

دیا جاتا کہ وہ جیل خانہ میں ہے۔ بلکہ اس کے حواس وجدان، عقل، جسم، خلق، شخصیت، تمام چیزوں کی تربیت بات ہی بات اور کھیل ہی کھیل میں کردی جاتی ہے۔

۵۔ ہر لڑکا وہی کام کرتا ہے جو وہ چاہے۔ جب وہ مدرسہ پہنچتا ہے تو دیکھتا ہے بہت سے بچے مختلف کھیلوں میں مصروف ہیں۔ وہ بھی اس گروہ کے ساتھ شریک ہو جاتا ہے جو اس کی طبیعت اور مذاق کے مطابق ہو۔ اگر وہ ایک کھیل سے تھک جاتا ہے۔ تو دُوسرا شروع کردیتا ہے۔

۶۔ مانتسوری کے تعلیمی کھیل خاص اہمیت رکھتے ہیں۔ ان سے تربیتِ حواس و عقل میں بڑی مدد ملتی ہے بلکہ انہی کھیلوں پر تعلیم و تعلّم کا زیادہ تر مدار ہوتا ہے۔

فوائد اس سسٹم کا ایک بڑا فائدہ تو یہ ہے کہ طلبہ کو پُوری آزادیٔ عمل حاصل ہوتی ہے۔ ان میں اعتماد نفس کا مادّہ پیدا ہوتا ہے۔ ان میں عمل کا شوق اور جذبہ پیدا ہوتا ہے۔ انہیں یہ علم ہوجاتا ہے۔ کہ وہ خود اپنا احترام کیونکر کریں؟ دُوسرے کے بارے میں کیونکر سوچیں؟ سعی و اجتہاد کے خصائص اپنے اندر کس طرح پیدا کریں؟

دُوسرا فائدہ اس سسٹم کا یہ ہے کہ مدرّس کو اپنے اسباق کی تیاری کا کافی موقع ملتا ہے۔ اسے طلبہ کی ذہنیت اور جبلّت کے پہچاننے میں بھی کافی سہولت

ہوتی ہے ۔ وہ طلبہ کی رُوح میں گھُس جاتا ہے ۔ ان کے خلقی اور اجتماعی عیوب کی اصلاح پر قادر ہو جاتا ہے ۔ واقعہ یہ ہے کہ مدرّس طلبہ کی ماہیت اور حقیقت، طبیعت اور فطرت سے اس وقت تک واقف ہی نہیں ہوسکتا جب تک وہ اپنا کافی وقت ان کے ساتھ نہ صرف کرے اور ان کے بارے میں زیادہ سے زیادہ معلومات حاصل کرنے کی کوشش نہ کرے ۔ صرف اسی طرح وہ ان میں عاداتِ حسنہ پیدا کرسکتا ہے ۔ اور ان کے اخلاق و عادات کی نشو و نما کرسکتا ہے ۔

مدرّس کے فرائض

مانٹسوری کا قول ہے :۔
"ہم معلّمین بیج بوتے ہیں اور فصل کاٹتے ہیں ۔ ضروری ہے کہ ہم اپنے کام میں اخلاص اور دیانت کو ملحوظِ خاطر رکھیں ۔"

مانٹسوری کا یہ قول بالکل حقیقت پر مبنی ہے ۔ قوم کا مستقبل مدرّس کے ہاتھوں میں ہے ۔ آنے والی نسلوں کی بہتری اور برتری مدرّس ہی کے ہاتھ میں ہے ۔ ضروری ہے کہ مدرّس اپنے کام میں مخلص اور دیانت دار ہو ۔

یہ مدرّس ہی کا کام ہے کہ وہ اپنے طلبہ کے قلوب میں اچھی عادتیں راسخ کردے اور اپنے کام کے صلہ اور داد کی پروا نہ کرے ۔ ہم جو کچھ کرتے ہیں وہ اپنے بچّوں کی تحسین و تکمیل کے لئے کرتے ہیں ۔ بغیر صلہ اور ستائش کی تمنا کے ۔ ہماری فرصت کا ہر لمحہ اسی کام میں

صرف ہونا چاہئے ۔ ہمارے ہر کام کو مخلصانہ ہونا چاہئے۔ تاکہ ہم صحیح طور پر اپنا مقصد حاصل کرسکیں ۔ تاکہ ہم وہ نمونہ بن سکیں ۔ جس کی تقلید کی جائے ۔ ہم زندگی کو اور اس کی ماہیت کو سمجھ بھی سکیں اور سمجھا بھی سکیں۔ ہم جب مرض کے آثار دیکھیں تو فوراً اس کا علاج کرسکیں۔ ہم اچھی ، اور صحیح قیادت کرسکیں ۔ ہم ٹھیک اور مناسب رہنمائی کرسکیں ۔ ہمیں یہ نہ بھولنا چاہئے۔ کہ آبانے اپنی سب سے قیمتی اور گراں مایہ پونجی ہمارے حوالہ کی ہے ۔ ہمارا فرض ہے کہ ہم اس پونجی کی حفاظت کریں ۔ اور اسے ضائع نہ ہونے دیں ۔ اس کی صحیح نشوونما کریں ۔ یہاں تک کہ خدا اور ہمارا ضمیر ہم سے راضی ہو جائے ۔ اور ہم علم و تعلیم کی صحیح خدمت انجام دے سکیں ؏

(۳) طریقۂ تمثیلیہ

یہ سسٹم ـــــ حرکت ، عمل ، نشاط اور کھلی ہوا پر مشتمل ہے ۔ تاکہ تلامیذ اور مدرسین کی صحت درست رہے اس سسٹم کی رُو سے نہ درجہ بندی ضروری ہے ، نہ اسباق کے لئے کلاس کی ضرورت ہے ۔ اس میں اسباق باغیچہ کے صحن میں بھی دیئے جا سکتے ہیں، کھیل کے میدان میں بھی، اور کتب خانے میں بھی ۔

یہ سسٹم تعلیم کا ایک خاص ذوق پیدا کر دیتا ہے اطفال کو اسباق کی فہم میں آسانی اور سہولت ہوتی ہے طلبہ عمل پر زیادہ زور دینے لگتے ہیں ۔ اس سسٹم کی تعلیم سراسر عمل ہوتی ہے ۔ اور تلامیذ سرتا پا عمل بن جاتے ہیں ۔ اس وقت بہت ہشاش بشاش ہوتے ہیں ۔ جب کسی سبق کو تمثیل (Play) کے ذریعہ عمل میں لاتے ہیں ۔ آپ دیکھیں گے وہ اپنے تمام کام بڑی رغبت اور شوق سے انجام دیتے ہیں اور جو کچھ امکان میں ہوتا ہے کر گزرتے ہیں ۔ تاکہ ان کا کھیل (Play) زیادہ سے

لہ ملاحظہ ہو کتاب The Dramatic method of Teaching by H. Finlay Jhonson.

زیادہ کامیاب ہو۔ اگر انہیں اپنے ساتھیوں اور اُستادوں کا تعاون حاصل ہو پھر تو ان کے جوشِ عمل کی کوئی انتہا نہیں رہتی۔ اس سسٹم کا سب سے بڑا فائدہ یہ ہے کہ اگر مدرسہ میں پڑھے ہوئے تاریخی اسباق آپ کو یاد نہیں رہتے تو طریقۂ تمثیل (Play) سے فائدہ اُٹھانے کے بعد وہ اچھی طرح یاد ہو جائیں گے۔

رابرٹ لوئس اسٹیفنسن[1] کا قول ہے :

"ہم بڑے لوگ اپنے دوستوں اور ساتھیوں کے سامنے ایک قصہ بیان کرتے ہیں اور اس سے متاثر ہوتے ہیں۔ لیکن ایک بچہ جب ایسے موقعہ پر چُپ چاپ نہیں بیٹھ سکتا۔ وہ اسے کسی طرح بھی بروئے عمل لانا چاہتا ہے۔"

طریقۂ تمثیلیہ کے فوائد۔

طریقۂ تمثیلیہ سے روایت کی صحیح حقیقت اور ماہیت طالب علم پر منکشف ہو جاتی ہے۔ بشرطیکہ مدرّس کی پوری رہنمائی اسے حاصل ہو۔ پھر اس کی تالیف اور کتابت بھی

---

[1] Rebert Louis Stevenson

۱۸۵۰ء میں پیدا ہوا۔ ۱۸۹۴ء میں وفات پائی۔ انگریز تھا۔ بچوں کے لئے اس نے بہت سی کتابیں لکھیں۔ زندگی کا بڑا حصّہ بیماری اور علالت میں گزرا۔ اس کی اکثر تصانیف بسترِ علالت پر لکھی گئیں۔ اس کی قوتِ ارادہ اور قوتِ عمل بہت زیادہ تھی۔

اس کے لئے آسان ہوجاتی ہے ۔ وہ اس زمانہ کے لباس ، عادات افکار وغیرہ پر حاوی ہو جاتا ہے ، اس میں نقد کی صلاحیت پیدا ہو جاتی ہے اس سسٹم کا ایک فائدہ یہ بھی ہے کہ ۔ بھولی بسری باتیں یاد ہو جاتی ہیں ، اقدام اور خطابت کے لئے کافی وقت مل جاتا ہے ، بحث و کتابت اور سوال و جواب کا مادہ بھی پیدا ہو جاتا ہے

تاریخ کی تدریس !

تاریخ کا درس اگر تمثیلی طریقہ سے دیا جائے ، تو بہت سودمند اور کارگر ہوتا ہے ۔ طلبہ ، بادشاہوں ، لیڈروں ، بڑے بڑے لوگوں اور تاریخی شخصیتوں کی تمثیل سے بہت سے فائدے اٹھاتے ہیں اور تاریخی روایات کو زیر تمثیل لانے کے بعد ان کی بہت سی دبی ہوئی صلاحیتیں ابھر آتی ہیں ۔

تربیت دہندہ کو جاننا چاہئے کہ تمثیل کو کامیاب بنانے کے لئے ادبی اور اجتماعی کتابوں کے مطالعہ کی شدید ضرورت ہوتی ہے ، تاکہ وہ ان میں سے ادبی ، تاریخی ، خلقی ، اجتماعی ، روایات منتخب کرسکیں جو ان کے اور سوسائٹی و مجتمع کے لئے مفید ہوں ضروری ہے کہ جہاں یہ سسٹم رائج ہو وہاں لائبریری بہت عمدہ ہو ، اور متعلقہ عنوانات پر مستند اور اچھی کتابوں کا معقول ذخیرہ موجود ہو ، جو طلبہ کے عقلی اور علمی مادہ کو شگفتہ کریں ، اور ان سے

مراجعت کرکے وہ اپنے علم اور معلومات میں خاطر خواہ اضافہ کرسکیں ،

مدرس کا فرض ہے کہ وہ طلبہ کی ایسی کتابوں کی طرف رہنمائی کرے جو موضوع تمثیل کی مناسبت رکھتی ہوں، ایک فائدہ اس طریقہ کا یہ بھی ہے کہ طلبہ کتابوں سے بے نیاز نہیں ہوسکتے ، وہ مجبور ہیں کہ اپنے موضوع پر ایک نہیں درجنوں کتابوں کا مطالعہ کریں اور اُن سے کام کی باتیں نوٹ کریں ، اپنی مشکلیں استاد کی مدد سے رفع کریں ، اور اقدام و عمل کی راہیں پیدا کریں ، وہ بحث مباحثہ پر بھی مجبور ہوتے ہیں ، اور اس سے بھی اُن کے علم اور معلومات میں خاص اضافہ ہوتا ہے ، ان میں ایک خاص توازن پیدا ہو جاتا ہے اور وہ کام کی بات لینے ، اور غیر ضروری بات چھوڑنے پر مجبور ہو جاتے ہیں ، یہ بھی ہوتا ہے کہ ایک لڑکا تمثیل کا ایک پارٹ کرنا چاہتا ہے ، لیکن ساتھیوں کی اکثریت اسے اس کام کے لئے موزوں نہیں سمجھتی ، وہ اکثریت کے آگے سر جھکانے ، اور اپنا ارادہ ترک کرنے پر مجبور ہو جاتا ہے اور اپنی جگہ اپنے دوسرے ساتھی کے لئے چھوڑ دیتا ہے ، اس طرح صلاحیت اور استعداد کا بھی امتحان ہوتا رہتا ہے اور اس کا غلط استعمال ہونے نہیں پاتا ، —— مدرس کے لئے ضروری ہے کہ وہ اپنے طلبہ کے لئے دوست ، اور بھائی اور ساتھی ثابت ہو ، حاکم مستبد نہیں ، وہ کسی کام کے کرنے یا نہ کرنے کا حکم نہ دے ، بلکہ ۴۴

۴۴ اس طرح سمجھائے کہ بات تمام طلبہ کے دل میں اتر جائے اور گھر کرے

۵۔ طریقہ مشروع (۱)

یہ سسٹم، امریکی ماہر تربیت و فلسفی جان ڈیوئی (۲) کے نظریہ پر مبنی ہے، اس سسٹم کے پانچ مراحل ہیں اور وہ یہ ہیں :—

(۱) صعوبت اور مشکل کا شعور۔
(۲) صعوبت اور مشکل کی شناخت اور اس کی حد بندی۔
(۳) اس کے حل پر غور، اس کے طریقے اور اس کی صحت پر استدلال،
(۴) ممکن حل کی طرف اشارہ)

اس نظریہ کے ماتحت ضروری ہے کہ تلمیذ خود،

---

(۱)۔ The Project Method

(۲) (Jhon Dewey) امریکہ کے فلسفۂ تربیت و علم النفس کا ممتاز فرد، بیسویں صدی عیسوی میں اپنے نظریات و تجارب کے لحاظ سے اس نے ایک خاص منزلت وقعت حاصل کرلی، اس موضوع پر اس نے بہت سی گراں بہا اور بیش قیمت کتابیں تحریر کیں، جو اساتذہ تربیت اور علم النفس کے لئے سنگ میل کا کام دیتی ہیں،

صعوبت اور مشکل کا شعور کرے، اسے حل کرنے کی تدبیر سوچے، اس کی اصل و حقیقت کو سمجھے، اس پر غالب آنے اور اسے حل کرنے کی کوشش کرے،

اس سسٹم میں طالب علم خود اپنی فکر پر بھروسہ کرتا ہے، خود ہی بحث کرتا ہے، خود ہی جواب دیتا ہے، اپنے گذشتہ تجارب کا سہارا بھی لیتا ہے، کسی دوسرے سے ہرگز مدد نہیں لیتا، سوائے اس صورت کے کہ بالکل مجبور ہو جائے۔

تفکر مستقل، تربیت استقلالیہ و عقلیہ کے لئے طریقۂ مشروع سے بڑھ کر کوئی اور طریقہ نہیں، اس سسٹم کا بنیادی اصول یہ ہے کہ طلبہ کے افعال، اُن مشروعات کے گرد گھومتے رہتے ہیں، جنھیں بروئے کار لانے کا انھوں نے پروگرام بنایا ہے،

امریکہ میں طلبہ کے لئے جو مشروعی (یا تشریحی) پروگرام بنایا جاتا ہے وہ زیادہ تر، حسب ذیل چیزوں پر مشتمل ہوتا ہے۔

(۱) مرغیوں کی تربیت (۲) مکاتب کی تنظیم
(۳) تکوینی اعمال (۴) مدرسہ کے میگزین کی طباعت واشاعت
(۵) جغرافیہ کے کسی موضوع پر کسی کتاب کی تدوین۔

یہ اور اسی طرح کے عنوانات پر طلبہ ابتدا سے لے کر انتہا تک تیاریاں کرتے ہیں، اور اپنے پروگرام کو کامیاب بناتے ہیں۔

اس سسٹم کو بروئے کار لانے میں، مدرس کو بہت زیادہ ماہر ہونا چاہئے۔ اس لئے کہ طلبہ کے فردی اعمال، تمام تر مدرس کی ہدایت اور رہنمائی سے تربیت پاتے ہیں۔

۶- طریقۂ لعب

یہ سسٹم، مشہور انگریز ماہر تربیت کالڈول کوک[1] سے منسوب ہے، اس سسٹم سے طلبہ میں عمل اور تنقیب کا جذبہ پیدا ہوتا ہے، محاضرات (لیکچرز) اور مناظرات سے بھی خاطر خواہ فائدہ اٹھایا جاتا ہے، تمثیل روایات، اور کتابت مقالات سے بھی انتفاع کیا جاتا ہے قصائد شعریہ سے بھی فائدہ اٹھایا جاتا ہے، فنون جمیلہ موسیقی، غنا نقاشی، اور تصویر کشی کو بھی اس سسٹم میں بہت دخل ہے

اب ہم یہ بتانا چاہتے ہیں کہ مدرس اسباق درس اور مبادی علوم میں، کس طرح طلبہ کی رہنمائی کرتا ہے:-

بچہ پر کھیل کا بڑا اثر پڑتا ہے، وہ کھیل سے بے انتہا دلچسپی لیتا ہے، پس اگر بچہ کو کھیل ہی کھیل میں سبق دیا جائے، اور اس کی تربیت کی جائے وہ رائخ بھی زیادہ ہوتی ہے اور سودمند بھی بہت ہوتی ہے، یہ سسٹم اگر اصول اور ضابطہ کے ساتھ برتا جائے، تو اس سے خاطر خواہ فائدہ اٹھایا جاسکتا

---

[1] ملاحظہ ہو کتاب The play way. By H. Cold well Cook.

ہے ، مدرسہ کے احاطہ میں ، کتابت ، قرأت ، قواعد ، انشا ، حساب ، جغرافیہ ، نقاشی ، تصویر کشی ، غنا ، وغیرہ کی تعلیم بہ حسن و خوبی دی جاسکتی ہے ، مدرس کے لئے بہتر یہ ہے کہ مبادئ علوم کی تدریس و تربیت میں طبیعت پر بھروسہ کرے ، نقشے ، تصویریں کتابیں ، نمونے اصطلاحات علمیہ ، یہ چیزیں اچھی طرح نہ بچہ کی سمجھ میں آسکتی ہیں ، نہ ان سے اُسے مستفید کیا جاسکتا ہے اس قسم کی تدریس سے بچہ میں لذت اور سرور کا مادہ نہیں پیدا ہوتا۔

مدرس کے واجبات!

مدرس اگر اس سسٹم کے ماتحت طلبہ کو تعلیم دے ، تو اس کے لئے ضروری ہے کہ :-

(۱) طلبہ کو بتائیے کہ یہ دنیا جو انھیں گھیرے ہوئے کیسی ہے ؟ اور وہ اُسے کس طرح محسوس کرتے ہیں ؟

(۲) جو کچھ بچے دیکھیں ، مدرس انھیں اکسائے کہ خود اپنا تاثر بیان کریں ، اور جو کچھ ان کے دل میں ہے ، اس کی اچھی طرح تعبیر کرسکیں ،

(۳) طلبہ کو بحث و جدل کی پوری آزادی دے ، ایک دوسرے سے خوب بحث کریں ، یہاں تک کہ اپنے خیالات و محسوسات اور جذبات کی تعبیر پر پوری طرح قادر ہو جائیں ،

مدرس کو یہ بھی چاہیئے ، کہ اگر وہ اپنے مذاکرہ میں

عالم طبعی کی طرف رغبت دیکھے کہ اسرار حیات پر وہ غور و فکر کرتے ہیں، تو انھیں اور زیادہ تجربہ اور تفحص پر اکسائے، یہاں تک کہ اس تجربہ اور تفحص سے اُن میں نشاطِ کار کا جذبہ پیدا ہو جائے، اور وہ اپنے میل و استعداد سے مکمل فائدہ اٹھاسکیں، بحث و اطلاع کی طرف راغب ہوں اور حسب ضرورت استاد سے مدد بھی لیں،

اگر جوان طلبہ میں تفحص اور اطلاع کا جذبہ پیدا ہو، تو اُن کی بھی قرار واقعی حوصلہ افزائی کرنی چاہیئے اُن کی اس بھڑکتی ہوئی آگ کو بجھانے یا مدھم کرنے کی ہرگز کوشش نہیں کرنی چاہیئے، اس طرح تحقیق و تفحص، تلاش اور جستجو کی امنگ پیدا ہوتی ہے، اور وہ زندگی کے میدان میں بہت کام دیتی ہے، مدرس کو کوشش کرنی چاہیئے۔ کہ اس کے طلبہ اُن آلات کی طرح نہ ہوں! جو دوسروں کے ہاتھ کے محتاج ہوتے ہیں، نہ ان حیوانوں کی طرح ہوں، جو سمجھ بوجھ سے محروم ہوتے ہیں وہ بغیر فکر کے عمل نہ کریں، ان کا عمل فکر کا تابع ہونا چاہیئے!

۷۔ ذکرولی سسٹم

یہ سسٹم، ماہر تربیت و علم النفس، اوویز ذکرولی[1] کے نام سے منسوب ہے۔ اس کی اپنی تربیت گاہ بروکسل کے مضافات میں تھی جس کا نام ڈرمتاج[2] تھا، درمتاج بروکسل کی ایک سڑک کا نام ہے، ۱۹۲۷ء میں ذکرولی اپنی تربیت گاہ، وہاں سے منتقل کر کے پایۂ تخت کے قریب لے آیا

جدید اصول تربیت، جدید علم النفس، اور جدید فن تعلیم کا یہ سب سے بڑا مرکز ہے، یہاں تربیت جسمیہ پر بھی، تربیت حواس کے ساتھ زور دیا جاتا ہے، اور تربیت عملیہ بھی نظر انداز نہیں کی جاتی، اعتماد اس سسٹم کا خاص جوہر ہے، اس میں تربیت کا کوئی گوشہ نظر انداز نہیں کیا جاتا، عقل، روح اور اجتماعیت سب کو پورا پورا حصّہ دیا جاتا ہے، تلمیذ کو پوری پوری آزادی عمل دی جاتی ہے۔ کھیل کے دوران میں بھی تعلیم کا سلسلہ جاری رہتا ہے، طلبہ کو حرکت اور عمل کی طرف خاص طور سے راغب کیا جاتا ہے، کھلی

---

(1) Ovide Decroly

(2) Ecoled, Hermitage

ہوا میں سبق دیا جاتا ہے، جہاں کلاس کی گھنٹن محسوس نہیں ہوتی، سبق اتنا ہی اور وہی دیا جاتا ہے، جو عقل و ذہن سے مناسبت رکھتا ہو، طبیعت کے مطابق ہو، اس سسٹم کے ماتحت مدرسہ، زندگی اور اس کے کوائف سے بالکل متصل رہتا ہے، تلمیذ زندگی کے لئے سیکھتا ہے، سبق اس لئے حاصل کرتا ہے کہ اچھی طرح زندہ رہ سکے، اور زندگی سے پورا پورا فائدہ اٹھا سکے، ذکرولی کی تربیت گاہ میں کلاسوں کی حیثیت کارخانوں، اور لیبو ریٹریوں کی سی ہے، چھوٹے سے چھوٹے بچوں کی بھی اسی طرح کھلا کھلا کر اور بہلا پھسلا کر تعلیم دی جاتی ہے، مار پیٹ اور سزا و عقوبت کا نام بھی نہیں،

مبادیات

ذکرولی نے اپنی تربیت گاہ کے جو مبادیات وضع کئے ہیں وہ حسب ذیل ہیں:-

(۱) قوت مشاہدہ! طلبہ مدرسہ میں جو کچھ دیکھتے ہیں جو کچھ ان کے گردوپیش ہے، اُسے دیکھنا، سمجھنا جاننا، حواس کا صحیح استعمال، باغیچہ اور کھیتی کی تنظیم، اکسکرشن،

(۲)— معلومات سے انتفاع! تجربہ اور عمل کے اثنا میں جو معلومات حاصل ہوں، اُن کی تربیت و تدوین، اور تنظیم، نقاشی، اور تصاویر کے ذریعہ ان کی توضیح و تشریح،

(۳)۔۔۔ لغت و تعبیر کی طرف توجہ! ذکرولی، لغت کو تدریس و تربیت میں بہت اہمیت دیتا ہے، یہاں تک کہ تلمیذ تعبیر مافی النفس پر اچھی طرح قادر ہو جائے، وہ اپنے افکار، اپنی زبان، اپنے قلم، اپنے نقش سے اچھی طرح ظاہر کر سکے، اسی لئے اس سسٹم میں تلمیذ کو نقاشی، غنا، قرآت طباعت، اور موسیقی میں بھی درک پیدا کرایا جاتا ہے، اور یہ تمام کے تمام وسیلہ، تعبیر ہیں،

(۴)۔۔۔ میلان کی رعایت! عقل کے میلان، اور اس کی سوسائٹی کی بھی پوری رعایت محفوظ رکھی جاتی ہے!

(۵)۔۔۔ اعتماد نفس اور تعاون! ذکرولی سسٹم میں، اعتماد نفس، اور تعاون کو بھی خاص اہمیت حاصل ہے، ذکرولی کی تربیت گاہ میں طالب علم کو خاص طور پر، اعتماد نفس، اور تعاون کے جوہر سے آشنا کیا جاتا ہے، وہاں تلمیذ کو کافی وقت دیا جاتا ہے کہ وہ تجربہ کرے، عمل کرے، مطالعہ کرے، بحث و مناظرہ کرے، اور اصل حقیقت تک پہنچے،

ذکرولی تربیت گاہ میں تربیت خلقی، تربیت وجدانی، تربیت اجتماعی، تربیت جسمانی عقلی اور ذہنی کو بھی ہمہ وقت پیش نظر رکھا جاتا ہے، وہاں کا طالب علم اپنے مدرسہ کے بھائیوں سے محبت کرتا ہے اپنے اساتذہ کی وقعت کرتا ہے، سوسائٹی کے ساتھ

تعاون کرتا ہے، وہاں کے طلبا کے اجسام مضبوط ہوتے ہیں، عقل پختہ ہوتی ہے، عواطف شائستہ ہوتے ہیں، ذوق سلیم ہوتا ہے، اخلاق کامل ہوتے ہیں مختصر سی عبارت میں یوں سمجھئے کہ وہاں کی تربیت کی غایت اصل، اعلیٰ کردار کا حصول ہوتا ہے۔

ذکرولی سسٹم میں، ایک اور بات بھی ہے۔ اس سسٹم میں، مدرسہ اور گھر میں بھی پورا تعاون، اور ربط ملحوظ رکھا جاتا ہے، ذکرولی کی تربیت گاہ میں، مستقل تعلق، گھر اور مدرسہ، معلم اور باپ، کے درمیان قائم رہتا ہے، وہاں ابا کو دعوت دی جاتی ہے کہ وہ مدرسہ آئیں اور اساتذہ سے، مدرسہ اور طلبہ کی فلاح وصلاح کے سلسلہ میں بحث و گفتگو، صلاح و مشورہ کریں، غرض اس سسٹم میں طلبہ کو ہر جہت اور ہر اعتبار سے کامل بنانے کی خاص کوشش کی جاتی ہے، اور ان کی تمام صلاحیتوں کو نہایت ملاطفت کے ساتھ ابھارنے، اکسانے اور بڑھانے کی کوشش کی جاتی ہے!

طریقۂ اعجاب[1]

یہ سسٹم، دوسرے طریقوں سے بالکل الگ اور مختلف ہے، اس میں متکلّم سے زیادہ سماعت کو دخل ہوتا ہے، اسی طرح عمل سے زیادہ قابلیت کو، دخل ہوتا ہے، اس میں تاثر زیادہ ہوتا ہے، مؤثریت کم۔

میں ایک واقعہ اب تک نہیں بھولا، امریکہ کے ایک ثانوی مدرسہ میں ایک مدرس کی تقریر میں بیٹھا سن تھا، انگریزی ادب کی نئی کتابوں پر وہ بحث و گفتگو کر رہا تھا، اس کا انداز تقریر نہایت جامع اور دلنشیں تھا، موقع موقع سے کتابوں کے بھی وہ پڑھ رہا تھا، میں نے اس وقت طلباء پر ایک نظر ڈالی سب اس محویت کے عالم میں بیٹھے ہوئے تھے کہ صاف معلوم ہو رہا تھا اُن کے شعور میں حرکت پیدا ہو رہی ہے، ان کی رگوں میں خون سما ہوا ہے، اور وہ اس سحر حلال سے بری طرح متاثر ہیں، اس وقت اگر ناقوس بھی بجایا جاتا، تو اُن کی محویت میں فرق نہ آتا۔

---

(۱) Appreciation.

(۱)

طریقۂ ابتکار و انتاج

اس سسٹم میں طالب علم خود اپنے اوپر چھوڑ دیا جاتا ہے، کہ معلم کی رہنمائی میں سابق معلومات سے اور فکر و خیال، بحث و اطلاع، مقالات کی کتابت قصیدہ کی تحریر، قوت متخیلہ سے کام لے کر کسی نقش کے ارتسام، یا کسی تصویر کی خط کشی، یا کسی تاریخی حادثہ کی رنگ آمیزی، یا تجارب کے اجرا، یا ہاتھ سے کرنے والے کاموں کے اشتراک، یا آلۂ موسیقی و غنا سے استمداد، یا مسائل ریاضیہ کا حل، یہ اور اس طرح کے سارے کام طالب علم کو زیادہ تر خود اپنے نفس، اور فکر، اور خیال کی رہنمائی میں کرنے پڑتے ہیں، کمتر ایسا موقعہ پیش آتا ہے کہ وہ استاد کی رہنمائی کا محتاج ہو، اور اس کی ہدایت اور صلاح و مشورہ پر اپنے عمل کی بنیاد رکھے۔

یہاں یہ فرق بھی یاد رکھنا چاہیئے کہ تعلیم کے وقت، جب قدیم مدرسوں میں رٹنے، اور زبانی یاد کرنے پر ساری قوت صرف کی جاتی ہے، جدید مدرسوں میں خود نتائج کے مرتب کرنے اور خود مشکلات کے حل کرنے پر زور دیا جاتا ہے، اور یہ فرق کوئی معمولی فرق نہیں ہے

(۱) Creation

طریقۂ تدریب و مرانت[1]

تعلّم کے لزومات میں سے تکرار بھی ہے ، بغیر مشق و تمرین ، یعنی بغیر تکرار اور اعادہ کے حقیقت تک پہونچنا ، مقصد کا حاصل کرنا ، اور علم کا مستحضر کرنا آسان نہیں ہوتا ، مکتب سے لے کر یونیورسٹی تک ہر دور ، اور ہر مرحلہ میں اس اصول کو پیش نظر رکھنا پڑتا ہے ، لیکن اس تکرار و اعادہ سے مطلق ، طوطے کی رٹ نہیں ہے کہ بغیر سوچے سمجھے ، تکرار کا سلسلہ جاری ہے ، یہ سلسلہ جاری رہنا چاہئے ، فہم و فکر کے ساتھ ،

ماہرین تعلیم کا خیال ہے کہ مشق و تمرین سے انسان درجۂ کمال تک پہنچ جاتا ہے ، لیکن ضروری ہے کہ یہ مرانت ، انتباہ ، اور رغبت ، اور ارادہ کے ساتھ ہو ، تعلیم کے ساتھ عمل کا پہلو پیش نظر رہے ، مشق و تمرین اور ارادہ مراجعت کے سلسلہ میں ، ماہرین تعلیم نے جو اصول منضبط کئے ہیں وہ یہ ہیں ،

(۱) ـــــ مشق کا مقصد واضح ہو۔

(۲) ـــــ درس کے نکات ملحوظ خاطر ہوں ،

---

(۱) Drill

(۳) ان نکات سے دوسرے اسباق میں بھی فائدہ اٹھایا جاسکتا ہو ،

(۴) تکرار و اعادہ ، رغبت اور ارادہ پر مبنی ہو،

(۵) اختصار پیش نظر رہے

(۶) مشکل مسائل پر پوری توجہ کی جائے ،

(۷) نظر کی گہرائی سے کام لیا جائے ،

(۸) زبانی یاد کرنے میں ، اصول کلّی پیش نظر ہو،

طریقہ ارشادیہ[1]

تعجب کی بات ہے کہ یہ سسٹم، ہمارے ابتدائی، اور ثانوی مدارس میں اَبتک غیر مانوس سا ہے، اس سسٹم کی رو سے طالب علم کو، مدرس کی ہدایت اور نگہداشت سے فائدہ اٹھانے کا پورا موقعہ ملتا ہے، ایک بھی طالب علم تنِ تنہا کوئی سبق اتنی اچھی طرح یاد نہیں کرسکتا، جتنا، وہ استاد کی موجودگی اور نگرانی میں تیزی اور سرعت کے ساتھ یاد کرسکتا ہے، اگر ضرورت ہو، تو بیچ بیچ میں استاد سوالات کرکر کے، اس کی یادداشت کو تیز اور قوت حافظہ کو قوی کرسکتا ہے۔

اس ضرورت کے محتاج یوں تو سب ہی طلبہ ہوتے ہیں لیکن ضعیف اور متوسط قابلیت کے طلبہ کے لئے تو یہ طریقہ اکسیر ہے۔ انھیں اس سے بہت زیادہ فائدہ پہنچتا ہے، نئے طرز کے مدرسوں میں اس سسٹم کو اتنی اہمیت دی جاتی ہے کہ ہر جماعت کے لئے کم سے کم ایک گھنٹہ روزانہ اس طرز تدریس ـــــ طریقۂ ارشاد ـــــ کے لئے وقف ہوتا ہے، اسے نصاب کا ایک جزو سمجھا جاتا ہے، اور اُسے پوری اہمیت دی جاتی ہے، اس موضوع پر بہت سی کتابیں بھی ہیں، جن میں بتایا گیا ہے کہ ہم کیونکر یاد کریں!"

---

[1] Supervised study.

طریقۂ اختیار[1]

اختیار بھی، طریقۂ ارشادیہ ہی کی ایک قسم ہے مجھے اچھی طرح یاد ہے، جب میں کولمبیا یونیورسٹی میں پڑھتا تھا، تو میرے استاد تواس اسکندر جو تعلیم و تربیت سے متعلق بہت سی کتابوں کے مصنف ہیں فرمایا کرتے تھے "پڑھاؤ اور پرکھو پڑھاؤ اور امتحان لو"[2]

اختیار سے مراد ہے مراجعت، ایک ماہر معلّم، اچھی طرح جانتا ہے کیونکر، اور کب وہ اس سسٹم سے فائدہ اٹھائے؟ اور اپنے طلبہ میں سے کن طلبہ کو اس اصول کی زد میں لائے؟

تدریس و تعلیم کے یوں تو بہت سے اصول اور ضابطے ہیں، لیکن ذیل میں ہم چند خاص اور اہم، اصولوں اور ضابطوں کا ذکر بطور خلاصہ کرتے ہیں، کیونکہ اُن میں سے اکثر ہم گزشتہ صفات میں لبسط و تفصیل سے گفتگو کر چکے ہیں:-

(۱) — طریقۂ استقرائیہ

---

(۱) Testing

(۲) Teach & Test and Teach & test.

(۲) طریقۂ قیاسیہ ،
(۳) لیکچر سسٹم ،
(۴) طریقۂ سقراطیہ ،

طریقۂ تنقیبیہ ، حسب ذیل اصولوں پر مشتمل ہے :-

(۱) ڈلٹن سسٹم ،
(۲) مانٹسوری سسٹم ،
(۳) طریقۂ تمثیلیہ ،
(۴) طریقۂ مشروع ،
(۵) طریقۂ لعب ،
(۶) ذکرولی سسٹم ،
(۷) طریقۂ اعجاب ،
(۸) طریقۂ ابتکار و انتاج
(۹) طریقۂ تدریب و مرانت ،
(۱۰) طریقۂ ارشادیہ ،
(۱۱) طریقۂ اختیار ،

سوالات کی اہمیت

تعلیم و تدریس میں، سوال و جواب کو بھی اچھی خاصی اہمیت حاصل ہے، اور ماہرین تعلیم و تربیت اسے ایک اہم عنصر قرار دیتے ہیں۔

سوالات کے اغراض! سوالات کے اغراض یوں تو بہت سے ہیں، چند خاص الخاص یہ ہیں:-

(۱) طلبہ کل جو سبق پڑھ چکے ہیں، اور آج انھوں نے جو پڑھا ہے، ان دونوں میں بہترین ربط سوال و جواب میں سے پیدا ہو سکتا ہے۔

(۲) معلومات واذہان کو طلبہ کے ذہن و دماغ میں راسخ کرنا ہو، تو سوال و جواب سے بڑی مدد لی جاسکتی ہے۔

(۳) حقیقت تک پہونچنے کے لئے فکر و انتباہ اور بحث کو بھی سوال و جواب کی اساس و بنیاد، بنایا جاسکتا ہے۔

(۴) عمل کا شوق، صواب کی طرف رغبت، اچھے کاموں کی طرف میلان بھی سوال و جواب کا رہین منت ہوتا ہے۔

شروط اسئلہ! سوالات کا صحیح مقصد پورا کرنے کے

لئے ضروری ہے کہ سوالات کے شروط پورے کئے جائیں جو یہ ہیں :-

(۱) سوالات سہل ہوں ، فکر عمیق کے طالب نہ ہوں،

(۲) سوالات مختصر لیکن واضح ہوں -

(۳) ایسے سولات ہوں کہ طلبہ میں اشتباہ اور اضغاء کا مادہ پیدا ہو -

(۴) سوالات عام نہ ہوں محدود ہوں کہ طلبہ کو ظن و تخمین اور قیاس آرائی کا زیادہ موقع نہ ملے ، سوال ایک حقیقت معینہ تک محدود ہو ، اور اس کا جواب صرف ایک ہی ہوسکتا ہو،

(۵) تکلف سے بری ہو ،

(۶) ایسا سوال ہو کہ تمام طلبہ میں جواب دینے کی امنگ پیدا کر دے ،

(۷) طلبہ کی استعداد اور اہلیت سے مطابقت رکھتا ہو ، ہر طالب علم یہ سمجھے کہ وہ اس کا جواب دے سکتا ہے ، اور یہ کہ یہ سوال اس سے کیا گیا ہے -

(۸) ایسا سوال بھی نہ ہو جو طلبہ کو غور و فکر سے محروم کردے -

اس سلسلہ میں مدرس کو چند اور باتیں بھی پیش نظر رکھنی چاہئیں ، اگر سوال طلبہ کو مشکل معلوم ہو تو حکمت کا تقاضا یہ ہے کہ اسے کسی

دوسری شکل میں اُلٹ پلٹ دیا جائے، یہاں تک کہ اس کا جواب آسان ہو جائے، معلّم کو ایک اور قیمتی اصول پر بھی پوری توجہ کرنی چاہیئے، یہ کہ وہ اپنے سوالات کے ذریعہ ہمیشہ طلبہ کو فکر و تامل پر اکسائے، تاکہ ان کی قوتِ ملاحظہ و تفکر میں نمو پیدا ہو۔

اچھّے سوالات کے ذریعہ طالب علم کو آنے والے درس کے لئے خوبی کے ساتھ تیار کیا جاسکتا ہے انھیں اعادہ اور مراجعت پر بھی آمادہ کیا جاسکتا ہے۔ ایک قول ہے، اور بڑا اچھّا قول ہے کہ "اچھا سوال آدھا علم ہے!"

سوالات کے فوائد! سوالات کے بہت زیادہ فائدے ہیں، اس سے طلبہ میں انتباہ کا جذبہ پیدا ہوتا ہے، جواب دینے کے سلسلہ میں غور و فکر کی عادت پڑتی ہے، حفظِ نظام میں مدد ملتی ہے، اگر آپ دیکھیں کہ اثناء درس میں کوئی طالب علم کسی دوسرے کی طرف متوجّہ ہے تو درس کے سلسلہ میں اس سے سوالات شروع کردیجئے۔ یا اگر آپ یہ دیکھیں کہ دورانِ سبق میں کوئی طالب علم، کسی خیال میں کھویا ہوا ہے، تو سبق سے متعلق اس سے سوالات شروع کردیجئے، اُسے اپنے سوالات سے افسادِ نظام کا کوئی موقعہ نہ دیجئے۔ وہ بڑی آسانی سے راہِ راست پر آجائے گا، سوالات کو

پیمانہ کے طور پر بھی ایک مدرس استعمال کر سکتا ہے سوالات سے بڑی آسانی کے ساتھ مدرس اندازہ لگا لے سکتا ہے، کہ کون طالب علم ضعیف ہے، کون قوی ؟ کس میں اختیار کی قوت ہے، کون ناکارہ؟ کس پر زیادہ توجہ کی ضرورت ہے، کس پر کم؟ پھر اسی اندازہ کے مطابق، وہ ضعیف کو قوی بطی کو ذہین، بد شوق کو شوقین بنانے کی کوشش کرتا ہے، اور کامیاب ہوتا ہے، اس طرح اصلاح کا کام بہت آسان ہو جاتا ہے۔

سوالات سے مدرس کے حُسنِ ذوق اور قابلیت کا بھی صحیح صحیح اندازہ ہو جاتا ہے، سوالات جس طرح طلبہ کی معرفت کی کسوٹی ہیں، اسی طرح مدرس کی معرفت کا بھی پیمانہ ہیں، سقراط نے بھی اپنے نظام تعلیم و تدریس میں سوالات کو پوری پوری اہمیت دی ہے،

سوالات کی نوعیت!

سوال کی قدر و قیمت کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ اس کا جواب کیسا دیا جا سکتا ہے؟ درس کی ابتدا میں سوالات کی نوعیت ایسی ہونی چاہیئے کہ مدرس اندازہ کر سکے کہ سابقہ اسباق کہاں تک مختصر ہیں؟ اور دوسانِ درس میں سوالات کی نوعیت ایسی ہونی چاہیئے، جو آنے والے درس میں بھی کام دے اور اس سبق کی تکمیل میں بھی تعاون ہو، اور

قدم بہ قدم ان میں ملاحظہ، مشاہدہ، فکر، اور غور کی صلاحیت پیدا ہوتی جائے، درس کے آخر میں سوالات کی نوعیت ایسی ہونی چاہیئے کہ اس سے اجزا ایک دوسرے سے مربوط اور متصل ہو جائیں اور یہ معلوم ہو سکے کہ طلبہ کی سمجھ میں کون سا مسئلہ آیا، اور کون سا مسئلہ وہ نہیں سمجھ سکے؟

جب ہم یہ کہتے ہیں کہ سوالات بہت سود مند ہوتے ہیں تو ہمارا مطلب و مدعا یہ نہیں ہوتا کہ درس از اول تا آخر، سوالات ہی پر مشتمل ہو، اور یہ عقیدہ بھی نہیں ہے کہ جو مدرس اچھا سوال کرے گا، وہ اچھا سبق بھی دے گا، یہ مبالغہ ہے، اور ہم اس سے دور ہیں، تعلیم و تربیت سوالات ہی سے عبارت نہیں ہے، اگرچہ ہم اس کی ضرورت اور افادیت کے منکر بھی نہیں ہیں،!

یہ بھی یاد رکھنا چاہیئے کہ طلبہ، ہر وقت سوالات ہی کے مستحق نہیں ہوتے ہیں؛ اخبار و اطلاع اور معلومات کے بھی مستحق ہوتے ہیں، ان سے صرف پوچھنا ہی نہیں چاہیئے، بتانا بھی چاہیئے، بعض مدرس سوالات تو بہت کرتے ہیں، بتاتے بہت کم ہیں، یہ ان کی افسوس ناک غلطی اور کوتاہی ہے، ایسا نہیں ہونا چاہیئے، پوچھئے بھی اور بتایئے بھی، اس پوچھنے اور بتانے میں پورا پورا توازن ہونا چاہیئے،

اس کا بھی خیال رکھنا چاہیئے کہ دورانِ درس میں

اگر کوئی قصہ بیان کیا جائے ، تو قصہ بیان کرتے کرتے سوالات کا سلسلہ نہیں شروع کرنا چاہیئے ، بلکہ جب قصہ بیان ہوئے ، تب سوالات کئے جائیں ، سوالات کا مقصد یاد رکھنا چاہیئے ! یا تو تخیص و وضاحت ہوتا ہے ، یا تعبیر و توضیح ، سوالات کرتے وقت اس مقصد کو نظر سے اوجھل نہیں ہونا چاہیئے !

جوابات

اب ہم جوابات کی صورت و نوعیت کے بارے میں گفتگو کرنا چاہتے ہیں، مدرس کو جس طرح سوالات پر پوری توجہ کرنی چاہیئے، اسی طرح جوبات پر بھی اسے اپنی پوری توجہ مبذول رکھنی چاہیئے، جوابات ہی سے اندازہ ہوتا ہے کہ طالب علم نے مسئلہ کو کہاں تک سمجھا ہے؟ اور اس کی فہم و استعداد کا کیا عالم ہے؟ اگر درس ناقص، اور نامکمل ہوگا تو جوابات کبھی بھی صحیح اور درست نہیں ہو سکتے۔

جوابات کے شرائط! جواب اچھا اور مکمل اس صورت میں ہوسکتا ہے کہ اس کی عبارت معقول ہو، فکر و لغت کی غلطیوں سے مبرا ہو، ظن و تخمین کا اس میں دخل نہ ہو حقیقت اور واقعیت پر مبنی ہو، تکلف سے کام نہ لیا گیا ہو۔ اس کی ترتیب منطقی ہو، فہم و فکر پر دلالت کرتا ہو،

بعض مدرس اس معاملہ میں بھی زیادتی اور غلو سے کام لیتے ہیں، وہ چاہتے ہیں طالب علم کا جواب مکمل جملہ کی صورت میں ہو، اگرچہ جواب ایک کلمہ سے زیادہ کا طالب نہ ہو، مثلاً اگر کسی

طالب علم سے سوال کیا جائے، "یہ واقعہ کب رونما ہوا؟" تو مدرس صاحب اس جواب سے مطمئن نہیں ہوں گے کہ "فلاں سنہ میں" بلکہ وہ چاہیں گے کہ طالب علم یوں کہے، "یہ واقعہ فلاں سنہ میں رونما ہوا تھا!" یہ جواب ضرورت سے زیادہ ہے، اس طوالت پر کبھی اصرار نہیں کرنا چاہیئے، یہ بات سوال کی نوعیت پر منحصر ہے کہ وہ جواب میں جملہ تمام چاہتا ہے یا کلمۂ واحدہ؟ نوعیت کا جو تقاضا ہو، اس پر جواب منحصر ہونا چاہیئے، اور اسے قبول کر لینا چاہیئے، خواہ مخواہ کی مین میخ نہیں نکالنا چاہیئے اگر ہم یہ چاہتے ہیں کہ تلمیذ کا جواب جملۂ تام پر مشتمل ہو، تو ہمیں سوال بھی ایسا کرنا چاہیئے، جس کا جواب صرف جملۂ تام ہی کی صورت میں دیا جاسکتا ہو، ہمیں ایسا سوال نہیں کرنا چاہیئے، جس کا جواب کلمۂ واحد کی صورت میں دیا جاسکتا ہو۔

جواب کی تین صورتیں ہوسکتی ہیں، یا وہ صحیح ہوگا یا غلط ہوگا، یا اس کا کچھ حصّہ صحیح ہوگا، اور کچھ غلط، اب ماہر مدرس کا کام یہ ہے کہ وہ اس طرح الٹ پلٹ کر اپنا سوال دہرائے کہ جواب میں کوئی خطا اور غلطی نہ رہنے پائے، جواب کی غلطی کے کئی اسباب ہوتے ہیں، یا تو طالب علم سوال پوری طرح سمجھا نہیں ہے، یا اس کا علم ناقص، اور معلومات کوتاہ ہیں، یا اس کا حافظہ کمزور ہے، اور وہ یادداشت

سکا ناقص ہے، یا سوال کی عبارت پیچیدہ ہے، جواب کو یہ کہکر رد کر دینا کہ یہ غلط ہے، کافی نہیں، نہ یہ کوئی معقول علاج ہے، علاج یہ ہے کہ طالب علم سے قدم بہ قدم چل کر اس غلطی کی تصحیح کی جائے، یہاں تک کہ وہ اپنی غلطی محسوس کرے، صواب کو پہچان لے، اور حقیقت تک اس کی رسائی ہو جائے،

مدرس اگر یہ چاہتا ہے کہ اس کے الفاظ اور آرا میں وزن ہو، اس کی تعریف یا تنقیص کی قدر و قیمت طلبہ کے دل میں ہو، تو اسے چاہئیے اپنے شاگردوں میں سے ان کی مدح کبھی نہ کرے، جو مدح کے مستحق نہیں ہیں، نہ ان جوابات کی پذیرائی کرے، جو رد کر دینے کے قابل ہوں، اس کا فرض ہے کہ وہ غلطی کے بارے میں چشم پوشی اور در گزر سے کام نہ لے، بلکہ بلاغت اور ملاطفت کے ساتھ اُسے طالب علم پر واضح کر دے، تاکہ پھر اس کا احتمال باقی نہ رہے، اور طالب علم جواب کی طرف راجع ہو جائے۔

بعض اساتذہ وقت بچانے کے لئے یہ کرتے ہیں کہ خود طلبہ میں سے ایک دوسرے کو سوال و جواب پر لگا دیتے ہیں، ایک سوال کرتا ہے دوسرا جواب دیتا ہے، مدرس نگرانی اور نگہداشت کرتا رہتا ہے۔ اس طرح طلبہ میں سوال کرنے اور جواب دینے، دونوں باتوں کی صلاحیت پیدا ہو جاتی ہے۔

بعض مدرسوں میں یہ بڑی خرابی ہوتی ہے کہ

وہ موقع بے موقع بولنے کے عادی ہوتے ہیں، وہ چاہتے ہیں کہ خود ہی سوال کریں اور خود ہی جواب دیں، کیونکہ یہ عادت طلبہ کے لئے مضر ہے، انھیں اس سے کوئی فائدہ نہیں پہنچتا الٹا نقصان پہونچ جاتا ہے، مکتب سے لے کر ثانوی مدرسہ تک، کہیں بھی اس عادت کو جاری نہیں رکھنا چاہیئے۔!

برطانیہ اور یورپ کے متعدد شہروں میں یونیورسٹیاں
اور کالج، اور مدرسے، سینما سے، جغرافیہ، علمی مسائل
طبعی مسائل، تاریخی حقائق کے سلسلہ میں خوب مدد
لیتے ہیں؛ اس طرح مذکورہ فنون کے اسباق طلبہ کے
ذہن و دماغ میں اچھی طرح راسخ ہو جاتے ہیں، سینما
کو وسیلہ اور ذریعہ بناکر وہ بڑے بڑے جنگلوں کا
مشاہدہ کر لیتے ہیں، بڑے بڑے درخت کس طرح
کاٹے جاتے ہیں، یہ معلوم کر لیتے ہیں، لکڑی پر کٹنے
کے بعد کون کون سی تکوینی کیفیتیں گزرتی ہیں، اور
بالآخر وہ میز، کرسی، چوبی گھوڑے، یا فرنیچر کی صورت
میں تبدیل ہو جاتی ہے، یہ معلوم ہو جاتا ہے، کہ
سینما کے ذریعہ سے نبات کے ادوار نمو نظر کے سامنے
آجاتے ہیں، بیج کس طرح ڈالے جاتے ہیں؛ نبات
کا ظہور کس طرح ہوتا ہے؛ فصل پکتی کیونکر ہے؛
کاٹی کس طرح جاتی ہے؛ ان سب چیزوں کا بہ حسن و
خوبی مشاہدہ ہو جاتا ہے، وحشی جانوروں کا جنگل میں
کس طرح شکار کیا جاتا ہے؛ وحشی جانوروں کے
بچوں کو کس طرح پالا پوسا جاتا ہے؛ اور کس
طرح انھیں مانوس کرکے قابو میں لایا جاتا ہے؛ ان
سب چیزوں کا بھی اچھی طرح سے مشاہدہ ہو جاتا
ہے، غیر ممالک کے لڑکے کس طرح مدرسوں میں رہتے
ہیں؛ پڑھتے ہیں؛ کھیلتے ہیں؛ تربیت حاصل کرتے
ہیں؛ ان کی زندگی کس طرح گزرتی ہے؛ یہ سب

باتیں بھی بیک وقت مشاہدہ میں آجاتی ہیں ، غرض وہ مسائل جن کی معرفت بہت زیادہ محنت مصارف اور دشواری کا باعث ہے ، سینما کے ذریعہ چٹکی بجاتے حاصل ہو جاتی ہے ،

سینما کے ذریعہ بچوں ہی کو نہیں بڑوں کو بھی فائدہ پہونچایا جا سکتا ہے ، بیماری کس طرح پھیلتی ہے ؟ مرض کس طرح حملہ کرتا ہے ؟ جراثیم کیونکر کام کرتے ہیں؟ یہ سب باتیں پردہ سیمین پر بآسانی دیکھی اور سمجھی جا سکتی ہیں !

لیکن سینما کی موجودہ صورت مصلح نہیں ہے ، اس میں خامیاں بھی ہیں ، ان کی اگر اصلاح کرلی جائے تو بہت مفید بنایا جاسکتا ہے !

اکسکرشن ! سیر و سفر اور اکسکرشن سے بھی بہت فائدہ ہوتا ہے ، ایضاح حسیہ کے وسائل میں اسے اہم درجہ حاصل ہے ، کھیتی باڑی کے مشاہدہ سے اور آثار قدیمہ کی زیارت سے بہت نکتے حل ہو جاتے ہیں :

تختۂ سیاہ ! تختۂ سیاہ پر چاک سے کام لے کر مدرس بہت سی باتیں حل کر سکتا ہے ، اور طلبہ کی دماغی گتھیاں سلجھ سکتی ہیں ، مشکل کلمات کا حل ، دشوار قاعدہ کی تشریح ، نقاشی ، اور مصوّری میں ، تختۂ سیاہ بہت کام دیتا ہے ،

لغوی وسائلِ ایضاح

لغوی وسائل ایضاح بھی تدریس و تعلیم کے فن میں خاص اہمیت رکھتے ہیں اور ان میں سے چند کا ہم ذکر کرتے ہیں :-

عبارت سے وضاحت! امثال ، قواعد ، نظریات ، واقعہ ، کا ذکر کرکے ایضاح عبارت سے کام لیا جاسکتا ہے ، اگر طالب علم الفاظ ، مفردات ، ترکیبات ، کے مفہوم کی تہ تک نہ پہونچ سکے تو امثال سے وضاحت کا کام لیا جاتا ہے ، اور طالب علم کی رسائی حاصل کی جاتی ہے ،

قصہ! اطفال افسانہ و قصص سے خواہ واقعی ہوں یا خیالی ، سبق آموز ہوں یا مہمل بہت دلچسپی رکھتے ہیں ، ادبی ، علمی ، جغرافی ، اور تاریخی کہانیوں سے بھی انھیں بہت شغف ہوتا ہے ، ایک ماہر مدرس ان قصوں کہانیوں سے طلبہ کو بہت فائدہ پہنچاتا ہے ، اور چھانٹ چھانٹ کے ایسی کہانیاں سناتا ہے جو خفی کو جلی کردیتی ہیں ، مشتبہ کو حقیقت بنادیتی ہیں -

مغرب میں طلبہ کے لئے فن افسانہ گوئی نے بڑی ترقی حاصل کرلی ہے ، وہاں ہزاروں کی تعداد

ہیں ایسی کہانیاں رائج ہیں۔ اور کتابوں کی صورت میں موجود ہیں۔ جو ہر عمر اور ہر درجہ کے بچّہ کے لئے بے انتہا مفید اور سودمند ہیں۔ عربی کے قدیم طرزِ تدریس میں بھی یہ رعایت ملحوظ رکھی گئی تھی۔ چنانچہ اس سلسلہ میں بڑی عمدہ، مفید اور بیش بہا کتابیں ـــ ـــ مثلاً اغانی، امالی، عقدالفرید وغیرہ ـــــ موجود ہیں، موجودہ دَور کی رعایت کو پیشِ نظر رکھ کر، اگر ان کی ازسرِ نو ترتیب دی جائے اور ان میں سے کام کی باتیں اخذ کی جائیں تو بہت فائدے دکھائے جاسکتے ہیں۔ قصصِ عنترہ، الف لیلہ، ابوزید ہلالی، کلیلہ دمنہ، ذخیرۂ قصصیہ، وغیرہ سے بھی عربی میں بہت فائدہ اُٹھایا جاسکتا ہے۔ افسوس کی بات یہ ہے۔ کہ اس لٹریچر سے نہ ہم فائدہ اُٹھاتے ہیں نہ ہماری اولاد ؛

وصف! قوتِ بیان سے بھی طلبہ کو بہت فائدہ پہنچایا جاسکتا ہے۔ یعنی ایسی خوبی اور خوش اسلوبی کے ساتھ کسی مسئلہ کی وضاحت کی جائے کہ طلبہ کے دل میں بات اچھی طرح بیٹھ جائے۔ اگر آپ کسی جنگ کا حال بیان کریں۔ تو اس کا نقشہ اس طرح کھینچئے۔ کہ طلبہ یہ سمجھیں وہ میدانِ جنگ میں اپنی آنکھوں سے حرب وقتال کے مناظر دیکھ رہے ہیں؛ مدرّس وصف وبیان کے فن سے پُورا فائدہ نہیں اُٹھاسکتا اگر زبان اور لٹریچر پر اسے غیر معمولی دسترس نہ حاصل ہو۔ ضروری ہے۔ کہ مدرّس اس فن کی طرف پوری توجہ کرے ؛

شرح وتفسیر اکثر ایسا ہوتا ہے کہ سخت الفاظ تلمیذ سے حل نہیں ہوتے۔ یا پیچیدہ عبارت اس کی سمجھ میں نہیں آتی۔ اور وہ ایک مشکل میں گرفتار ہو جاتا ہے۔ اور

چاہتا ہے کہ مدرّس اس کی ایسی شرح و تفسیر کرے کہ بات پُورے طور پر اس کی سمجھ میں آجائے۔ اکثر ایسا بھی ہوتا ہے کہ طفل خود ایسا سوال کر بیٹھتا ہے جو شرح و تفسیر کا محتاج ہوتا ہے۔ مثلاً آسمان نیلگوں کیوں ہے؟ درخت ہلتے کیوں ہیں؟ ریل چلتی کیوں ہے؟ ان سوالات سے طفل کے جذبۂ علم و اطلاع پر روشنی پڑتی ہے۔ اب اُستاد کا کام یہ ہے۔ کہ وہ اس طرح جواب دے جو طفل کی عقل اور ذہن سے مناسبت رکھتا ہو۔

خلاصۂ کلام یہ کہ جہاں مدرّس کو یہ نصیحت کرتے ہیں کہ وہ وسائلِ ایضاح سے کام لے، وہاں ہم اسے یہ مشورہ بھی دیتے ہیں۔ کہ ان وسائل کے برتنے میں مبالغہ اور غلو سے کام نہ لے۔ ایسا بھی ہونا چاہیئے۔ کہ جو کچھ باتیں ہم اس سے ذِکر کریں، اور اسے خود خیال آرائی کا موقع دیں بجائے اس کے کہ شرح و توضیح فی الفور شروع کر دیں۔ مدرّس اگر ماہر ہے تو وہ خود سمجھ لے سکتا ہے کہ کون سا موقع شرح و وضاحت کا ہے اور کون سا سکون و سکوت کا؟

اسباق کے انواع

مدرسہ کی تعلیم کا مقصد ہے۔ کسبِ علوم و معارف، اور کسب کا مقصد ہے، حذاقت و مہارت، درس کی تین قسمیں ہیں:۔

(۱) معلومات
(۲) مہارت
(۳) ذوق و وجدان کی تربیت

اب ہم ان میں سے ہر ایک پر گفتگو کرتے ہیں ؎

معلومات! معلومات کا مقصد ہے، حقائق تک پہنچنا، وہ حقائق، جو طلبہ کے لئے غیر معروف ہیں۔ اُستاد کو یہ معلومات اس طرح پیش کرنا چاہئیں کہ طلبہ اُکتائیں نہیں رغبت اور شوق سے یہ معلومات حاصل کریں۔ اور ان معلومات کے ذریعہ حقیقت کی معرفت حاصل کریں ؎

مہارت مہارت کا تعلق ہے، محاکات، مشق، تدریب، اور تکرار سے یہ کام ایک خاص اور معیّن طریقہ سے انجام پانا چاہیئے۔ تاکہ عمل میں پُوری مہارت پیدا ہوسکے ؎

ذوق و وجدان کی تربیت یہ وہ اسباق ہیں جن سے ذوق اور وجدان کی تربیت ہوتی ہے جمالی احساس بیدار کیا جاتا ہے۔ بچہ میں اچھی چیزوں کی طرف میلان پیدا کیا جاتا ہے۔ اور بڑوں میں اچھی چیزوں کی پرکھ پیدا کی جاتی ہے ؎

مدرّس کو چاہیئے کہ وجدان کی تربیت بہت احتیاط کے ساتھ کرے۔ موسیقی کی طرف بھی مائل کرے۔ کہ یہ دل کی زبان ہے۔ اور اس کا اثر سحر انگیز ہوتا ہے۔ اسی طرح شعر اور تمثیل کی طرف بھی توجہ لازمی ہے۔ کہ یہ بھی انسان کے ذوق اور وجدان پر بہت زیادہ اثر انداز ہوتے ہیں۔ نقاشی کی طرف سے بھی غافل نہ ہونا چاہیئے۔ کہ مصوّروں کی زبان یہی ہے۔ اور اس کا بھی دل و دماغ پر بہت زیادہ اثر پڑتا ہے۔ ایک معمولی آدمی سے پوچھئے۔ کہ تم نے باغ میں کیا دیکھا۔ وہ کہے گا گھاس، پتّے، پھول۔ اور ایک ایسا آدمی جس کے ذوق و وجدان کی تربیت ہو چکی ہو، جواب دے گا، میں نے وہاں ایک نئی زندگی دیکھی، جو خدا کی قدرت پر دال ہے۔

طریق تدریس

سبق کی نوعیت اور کیفیت کے لحاظ سے، تدریس و تعلیم کا طریقہ بھی بدلتا رہتا ہے۔ جو طریقہ حساب کے درس کے لئے موزوں ہے وہی نقاشی کے لئے قطعًا غیر موزوں ہے۔ یہ آسان نہیں ہے کہ ہم اس سلسلے میں کوئی خاص طریقہ وضع کر سکیں۔ اس کا انحصار خود مدرّس کی مہارت اور حکمت عملی پر ہوتا ہے ٭

البتہ ہم یہ ضرور کہہ سکتے ہیں کہ تدریس میں ہر برٹ کے اصولوں کو پیشِ نظر رکھنا چاہیئے۔ یعنی مقدمہ، عرض، استنباط، تطبیق، تلخیص، اشارہ، مراجعت، یہ سب چیزیں درس کے ضروری اجزا میں شامل ہیں ٭

وجدان کی تربیت و تکمیل کے سلسلہ میں مدرس کو طریقۂ اعجاب[1]

[1] Appreciation.

سے بھی کام لینا چاہیئے ۔ یہ کہ متعلم سُنے ۔ اور جو کچھ سُنے اور دیکھے ، اس سے متاثر بھی ہو ۔ پھر مدرّس اپنی بات اس کے دِل میں اُتار دے گا ۔ اور اپنے حُسنِ بیان اور زورِ زبان سے اسے اپنی طرف مائل کر لے گا ۔ اور اس کے اندر وہ جذبہ اُبھار دے گا ، جو اس ذوق کی تکمیل و تربیت میں معاون اور مددگار ہوگا ۔

ہر برت کے اصول پر عمل کرتے ہوئے ، مدرّس کو موازنہ سے بھی کام لینا چاہیئے ۔ جو تلمیذ اور مدرّس کے درمیان ہو ۔ بعد میں ، مشق و تکرار سے بھی کام لیا جائے!

نصائح

طلبہ اور مدرسین کے لئے

۱۔ اپنے درس کی تیاری پر توجہ کرو ٭

۲۔ مقدمہ کا مقصد، درسِ جدید کے لئے، طلبہ کے اذہان کی تیاری ہے ٭

۳۔ دورانِ درس میں جو مقصد بیان کیا جائے۔ وہ کسی اور ذکر سے منقطع نہ ہونے پائے۔ اسے مسلسل رہنا چاہئے ٭

۴۔ وسائلِ ایضاح کے استعمال میں مبالغہ اور غلو سے ہرگز کام نہ لیا جائے ٭

۵۔ تدریس کا جو نقشہ اپنے ذہن میں مرتب کیا ہے۔ اسے طلبہ کے سامنے ظاہر نہ کیجئے ٭

۶۔ آپ کے افکار میں منطقی ترتیب ہونی چاہئے۔ اعمال منظم ہونے چاہئیں۔ سوال واضح ہونے چاہئیں ٭

۷۔ شرح کلمات میں مفرد الفاظ کے معنی کے طور پر جو لفظ بتائیے، وہ بہت زیادہ سہل ہو ٭

۸۔ تاریخی حقائق قصہ کی شکل میں پیش کئے جائیں تو بہتر ہے ٭

۹۔ ایک وقت میں، دو سوال نہ کیجئے ٭

۱۰۔ اثنائے کتابت میں طلبہ کی نشست بالکل ٹھیک ہونی چاہیئے۔ تاکہ ان کی آنکھیں کمزور نہ ہوں۔ اور کمر کبڑی نہ ہو ٭

۱۱۔ غلطیوں کی اصلاح شافی جواب سے کی جائے ٭

۱۲۔ تختۂ سیاہ پر کوئی غلط عبارت یا نقش نہ چھوڑیئے۔ فوراً مٹا دیجئے ٭

۱۳۔ وقتِ واحد میں متعدد احکام نہ دیجئے۔ اثنائے تکلم میں ہاتھ سے اشارے نہ کیجئے۔ طلبہ کو جواب دینے کے بعد کھڑا نہ رہنے دیجئے ٭

۱۴۔ اپنے کورس کی ہر جہت سے تیاری کر کے کلاس میں تشریف لے جائیے ٭

۱۵۔ تکلف سے دُور رہیئے ٭

۱۶۔ حوادثِ یومیہ اور سوسائٹی سے پُورا فائدہ اُٹھائیے ٭

۱۷۔ دورانِ تدریس میں ضرورت کی تمام چیزیں اپنے پاس موجود رکھئے۔ مثلاً کتاب، قلم، پنسل، دوات اور دُوسری متعلق چیزیں ٭

۱۸۔ طلبہ سے ایسے سوالات نہ کیجئے۔ جن کے جوابات تختۂ سیاہ پر لکھے ہوئے ہوں۔ پہلے انہیں مٹا دیجئے پھر سوال کیجئے ٭

۱۹۔ دورانِ درس میں حسب ضرورت تختۂ سیاہ کو وقتاً فوقتاً استعمال کرتے رہیئے ٭

۲۰۔ عمل کتابی کے دَور میں مدرس کو نگہداشت اور نگرانی کا کام جاری رکھنا چاہیئے ٭

۲۱۔ دورانِ تعلیم میں مدرّس کو اپنی جدّوجہد کا کوئی دقیقہ فروگزاشت نہیں کرنا چاہیئے ٭

۲۲۔ غلطی کو درست کرکے لکھنے کی طلبہ میں عادت ڈالنی چاہیئے۔ املا یا زبان کی غلطی ہوگی۔ تو تکرار و اعادہ سے خود بخود ٹھیک ہو جائے گی ٭

۲۳۔ مدرّس کو ہمیشہ چوکس رہنا چاہیئے ٭

۲۴۔ مدرّس کو چاہیئے۔ کہ وہ طلبہ کی استعداد و اہلیت کا اندازہ داں رہے ٭

۲۵۔ مدرّس کو اس طرح تیار ہوکر درجہ میں جانا چاہیئے کہ ہر طالب علم اس سے پُورے طور پر مستفید ہوسکے ٭

۲۶۔ کمزور طلبہ پر مدرّس کو خاص توجہ کرنی چاہیئے۔ تاکہ وہ دُوسروں کے برابر ہوسکیں ٭

۲۷۔ سبق میں جو مشکل الفاظ یا جُملے ہوں، ان کے معنی تختۂ سیاہ پر بھی لکھ دیئے جائیں، اور طلبہ کی نوٹ بک میں بھی نوٹ کرادیئے جائیں ٭

۲۸۔ وقت کی مناسبت سے، طلبہ کو موضوع دینا چاہیئے۔ مثلاً رمضان میں روزہ کا موضوع، بارش کا موضوع موسمِ گرما میں دینا چاہیئے۔ نہ کہ موسمِ سرما میں ٭

۲۹۔ مدرّس کا اثر طلبہ پر بہت گہرا ہوتا ہے ٭

۳۰۔ طلبہ پر بھروسہ کرو، انہیں اپنے کام میں شریک کرو، انہیں غور و فکر کا موقع دو، ان کے لئے عمل کی فرصت مہیّا کرو۔ جب وہ مدد کے محتاج ہوں، مدد کرو ٭

۳۱۔ اوقاتِ درس کے دو حصے ہونے چاہئیں۔ نصف اوّل کتابی تعلیم کے لئے، نصف آخر دستی تعلیم کے لئے ٭

۳۲۔ طالب علم سے اگر غلطی ہو، تو اس کی اصلاح کرکے قاعدہ اور نظریہ کی تشریح کرکے پھر سمجھاؤ ٭

۳۳۔ طلبہ کے پرچہ ہائے امتحانات اچھے چھپے ہوئے ہوں۔ کتابت صاف ہو ٭

ان ہدایات پر اگر عمل کیا جائے۔ تو بڑی آسانی سے طلبہ کو ہموار کیا جاسکتا ہے۔ اور ان کی صحیح تربیت کرکے انہیں مردِ کامل بنایا جاسکتا ہے ٭

ضمیمہ نمبر ۱

اِس کتاب کے عربی ماخذ

۱۔ مقدمۂ ابنِ خلدون۔
۲۔ احیاء علوم الدین للامام غزالی۔
۳۔ اصول التربیۃ والتعلیم للمرحوم احمد خیرالدین
۴۔ تاریخ التربیۃ للاستاذ مصطفیٰ امین بک۔
۵۔ "فی علم النفس" للاستاذ حامد عبدالقادر
۶۔ "فی علم النفس" للاستاذ حامد عبدالقادر و محمد عطیہ ابراشی۔
۷۔ تقریر مسترمان۔
۸۔ مجلۃ التربیۃ الحدیثۃ للجامعۃ الامریکیہ۔
۹۔ بالقاہرہ۔
۱۰۔ التربیۃ الانجلیزیہ۔
۱۱۔ الشخصیۃ۔

ضمیمہ نمبر ۲

اِس کتاب کے انگریزی ماخذ

(1) On Educarion, By, Bertrand Russell.

(2) The Nursery Years, By, Susan Issacs.

(3) What is & What Might be, By, Holmes.

(4) The Tragedy of Education, By, Holmes

(5) Democracy & Education, By, Bollard

(6) Democracy & Education, By, Dewey

(7) Psychology of Early Childhood, By, William Stern.

(8) The Teacher's Encyclopaedia

(9) The Measurment of Intelligence, By, Tesm.

(10) School & Child, By Jhon Dewey

(11) Hand Book of Tests, by, Cyril Burt.

(12) The Educative Process, by, Bogley

(13) Principles of Teaching, by Welton.

(14) Mental Tests, by, P. B. Bollard.

(15) Education : Its Data & First Principles by, T. Percy Nunn.

(16) New Schools for old, by, Evenlyn Dewey.

(17) The Adolt Scence, by, Stanley Hall.

(18) The Dramatic Method of Teaching, By H. Finlay-Jhonson.

(19) The Play Way, by, H. Coldwell Cook.

(20) The Teacher & The School, by. C. P. Colgrove.

(21) Principles of Class Teaching, by, Findlay.

(22) The Principles of Education, by. Raymort.

(23) Psychological Principles of Education by, Horne.

(24) Schools of To-Morrow, by Jhon Dewey.

(25) Text Book in the Principles of Education by, Henderson.

(26) The Foundations of Education, by Fmdlay

(27) The Improvement of Teaching, by Freeland

(28) Education, by, Campagnae.

(29) Errors in Schools, by, Jhon Adams.

(30) The Montessori Principles & Practice, by Culverwell.

(31) Educational Movements & Methods, by, Jhon Adams.

(32) Modern Elementary School Practice, by Freeland.

(33) Modern Developments in Education and Practice, by Jhon Adams.

(34) Emile on Education, by J. J. Rouss.

(35) Education on the Dalton Plan, by, Helen Parkhurst.

"تعلیمی نفسیات"

(از پروفیسر عبدالحی علوی)

قومی زبان اُردو میں درس و تدریس کی تمام ضروریات کو پُورا کرنے کے لئے بعض فنی و تکنیکی اصطلاحات کے اُردو تراجم کی ضرورت کا احساس کرتے ہوئے فاضل مصنف نے نفسیاتِ تعلیم پر یہ فقید المثال تصنیف پیش کی ہے۔ جس میں "نفسیات کسے کہتے ہیں"، "تعلیمی نفسیات کی ضرورت اور اس کی قسمیں نیز اس کے طریقے"، "توارث اور ماحول"، "نظامِ عصبی"، "جبلّتی میلانات"، "کھیل اور کام"، "جذبات"، "ذہانت اور اس کی پیمائش"، "ادراک"، "توجہ اور دلچسپی"، "تعلّم"، "مطالعہ کے اصول"، "حافظہ اور فراموشی"، "کام اور تکان"، "امتحانات"، "پیمائش"، "درجاتِ نشوونما"، "شخصیت"، "لاشعور"، آخر میں کتب محولہ اور اصطلاحات کی فرہنگ ——— نفسیات اور تدریس کے شعبہ میں سنگ میل ———

قیمت فی جلد چھ رُوپے

کتاب منزل کشمیری بازار لاہور

مردِ مومن

ڈاکٹر میر ولی الدین صاحب تجر علمی اور ذاتی درس و تدریس کے وسیع تجربہ سے انسانی کردار کی نفسیاتی کمزوریوں اور امراض کی تشخیص کر کے قرآن کے ذریعے تعمیرِ سیرت میں مہارتِ تامہ رکھتے ہیں۔ تصوفِ قرآنی کے رمز شناس، فلسفہ اور ادب کے جید عالم۔ چنانچہ "عبادت و استعانت" "نیکی علم ہے" "قرآن اور سیرت سازی" "تصحیح فکر" "قانونِ تجاذب اور سیرت سازی۔" "قرآن اور علاجِ حزن" "قرآن اور علاجِ غضب" "کامیاب زندگی کا قرآنی تصور" جیسے موضوعات پر ان کے بلند پایہ مقالات میں انسانی کمزوریوں کو اُجاگر کر کے مختلف تصورات کو واحد نصب العین کے زیرِ اثر پیش کیا گیا ہے۔ ان میں عہدِ حاضر کے نوجوانوں کے اس خیال کا مفصل جواب ہے۔ کہ دین صرف چند ناکامیاب۔ افسردہ دل اور آشفتہ دماغ ضعیفوں کے لئے ہے۔ دنیا میں کامیابی، کامرانی، مسرت و راحت دنیوی اصول کے عاقلانہ استعمال سے ہی حاصل ہو سکتی ہے۔"

"مردِ مومن" میں کامیاب زندگی کے لئے سیرت اور سیرت کی تعمیر کے لئے قرآنی اصول کی ضرورت کو واضح کیا گیا ہے۔

قیمت صرف تین روپے

کتاب منزل کشمیری بازار لاہور